دربارِ نبوت کی حاضری

مولانا
سید مناظر احسن گیلانی
مرحوم

الفرقان بکڈپو، ۳۱۔۱۱۴ نظیر آباد، لکھنؤ

دربارِ نبوت کی حاضری

مولانا

سید مناظر احسن گیلانی

مرحوم

الفرقان بکڈپو ۳۱/۱۱۴ نظیر آباد لکھنؤ

دربارِ نبوّتؐ کی حاضری

○

مولانا سیّد مناظر احسن گیلانیؒ

الفرقان بکڈپو نظیر آباد، لکھنؤ

نام کتاب ——————— دربار نبوت کی حاضری
مصنف ——————— مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ
سال اشاعت ——————— جنوری ۲۰۰۸ء
تعداد ——————— دو ہزار
باہتمام ——————— محمد حسان نعمانی
مطبوعہ ——————— کاکوری آفسیٹ پریس لکھنؤ
قیمت ——————— -/۱۵

ناشر

الفرقان بکڈپو، نظیر آباد (۳۱ نیا گاؤں مغربی) لکھنؤ

تقریب (از مولانا محمد منظور نعمانی مدیر الفرقان لکھنؤ)

۱۳۶۸ھ (۱۹۴۹ء) میں مختلف مقامات کے عازمین حج کے قافلوں میں کچھ رفقا کیساتھ تبلیغی کام کرتے ہوئے شدت سے اسکی ضرورت محسوس ہوئی تھی کہ اس مقصد کیلئے ہر ممکن کوشش کی جائے کہ حج کو جانے والوں کو حج و زیارت کا صحیح طریقہ، اسکے ضروری مسائل و آداب معلوم ہوں اور عشق و محبت کے وہ جذبات بھی کسی نہ کسی درجہ میں نصیب ہوں جو حج و زیارت کی گویا روح ہیں ———

اس میں شبہ نہیں کہ اس مقصد کی تحصیل کا فطری اور موثر ترین طریقہ حج کو جانے والوں پر اللہ کے مخلص بندوں کی محنت اور صحبت و رفاقت ہے۔ لیکن اس سلسلے میں بہت کچھ نفع خاص کر تعلیمیافتہ حضرات ایسے مضامین و مقالات سے بھی اٹھا سکتے ہیں جو اسی مقصد کو سامنے رکھ کر لکھے گئے ہوں ——— اسی بنا پر اس وقت طے کیا گیا کہ مختلف حضرات سے ایسے مضامین لکھا کر الفرقان کا ایک "حج نمبر" شائع کیا جائے۔ چنانچہ اسی سال "الفرقان" کا پہلا حج نمبر شائع ہوا جو مقصد کے لحاظ سے الحمدللہ توقع سے زیادہ مفید اور موثر ثابت ہوا۔

اس پہلے "حج نمبر" کی غیر معمولی افادیت و تاثیر کے تجربہ کے بعد اگلے سال ۱۳۶۹ھ میں پھر دوسرا "حج نمبر" شائع کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس کے لئے اس عاجز مدیر الفرقان نے اپنے مخدوم و محترم مولانا سید مناظر احسن گیلانی مرحوم سے درخواست کی کہ اگر ہو سکے تو الفرقان

کے اس حج نمبر کے لئے حافظہ پر زور ڈال کر اپنے "سفر حج" کی سرگزشت ہی قلمبند فرما دیں"۔۔۔۔ اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم کے درجے بلند فرمائے، انہوں نے میری اس استدعا کو قبول فرما کر ۲۲ سال پہلے کئے ہوئے سفر حج کی روداد حوالۂ قلم کرنے کا ارادہ فرمالیا۔

مولانا اس سفر میں جدہ کی بندرگاہ پہ بحری جہاز سے اتر کر پہلے مدینہ منورہ حاضر ہوئے تھے اور وہاں طویل قیام کر کے وہاں سے احرام باندھ کر حج کے لئے روانہ ہوئے تھے جب اس عاجز کی استدعا پر مولانا نے اس "سفر عشق" کی روداد لکھنی شروع فرمائی تو ع "لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم"۔۔۔۔ جذب و مستی میں لکھتے چلے گئے ۔۔۔۔ مدینہ منورہ اور مسجد نبوی کی حاضری اور زیارت روضۂ اقدس، اور دیار محبوب میں قیام کی روحانی لذتوں اور قلبی واردات کا بیان اتنا طویل ہو گیا، کہ مولانا نے الفرقان کی گنجائش کا لحاظ کرتے ہوئے اسی پر قلم روک دیا۔۔۔۔ مولانا کا یہ مقالہ (دربار نبوت کی حاضری) الفرقان کے ۱۳۶۹ھ (۱۹۵۰ء) کے "حج نمبر" میں شائع ہوا تھا ۔۔۔۔

شائقین کا تقاضا رہا کہ اس کو الگ کتابی شکل میں بھی شائع کر دیا جائے۔ لیکن "کتب خانہ الفرقان" کے کارکن اب تک اس فرمائش کی تعمیل سے قاصر رہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہی وقت مقدر تھا۔ اب رفیق محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے پیش لفظ کے ساتھ یہ شائقین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ اس کو قبول فرمائے، اپنے بندوں کے لئے نافع اور مولانا مرحوم کے لئے رفع درجات کا وسیلہ بنائے۔ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ○

پیش لفظ

از حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

اقبالؔ مرحوم نے مدینہ طیبہ کی اُس حاضری پر جو انہوں نے عالم تخیل اور دنیائے جذب و شوق میں اپنے اُس زار و نزار اور ناتواں جسم کے ساتھ نہیں جس کے متعلق انہوں نے حدی خواں ساربان سے کہا تھا کہ وہ اونٹ کو بہت تیز نہ لے چلے؛ ؎

کہ راکب خستہ و بیمار و پیر است

اپنی اُس روح کے ساتھ جو خود انہی کے الفاظ میں زندگی کی طرح "ہر دم جواں، ہر دم رواں" ہے حاضری کا شرف حاصل کیا تھا، یہ دو عارفانہ اور عاشقانہ شعر کہے ہیں ؎

حکیماں را بہا کمتر نہادند | بناداں جلوۂ مستانہ دادند
چہ خوش بختے چہ خرم روزگارے | در سلطاں بہ درویشے کشادند

واقعہ بھی یہی ہے کہ سفر حج سفر عشق ہے، صحت و ادائیگی فرض تو ایک خالص شرعی اور فقہی مسئلہ ہے اور قبولیت کا معاملہ بھی بندہ اور اللہ کے درمیان ہے، "فضولی درمیاں کیست" (بیچ میں بولنے والا کون؟) لیکن اس کے حقیقی روحانی فوائد و فیوض جبھی حاصل ہوتے ہیں جب سفر عاشقانہ بلکہ مستانہ ہو۔ اسی طرح مدینہ کی حاضری اہل قلوب کے یہاں وہی معتبر ہے جو حکیمانہ کے بجائے کلیمانہ اور عاقلانہ سے زیادہ عاشقانہ ہو۔

پھر اگر کسی شخصیت میں کلیمی کے ساتھ حکیمی اور عشق کے ساتھ عقل بھی جمع ہو جائے اور اس کو اس حکیمی اور کلیمی کے ساتھ قلم کی شکل میں وہ "عصائے کلیمی" بھی مل جائے جس کے متعلق خود اقبال نے کہا ہے۔ ع

جو ضرب کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا؟

تو پھر نہ صرف وہ خود اپنے عشق و مستی کے مزے اٹھاتا ہے بلکہ اس دولت کو اپنے قلم کی ضرب کلیمی سے دوسروں پر بھی لٹاتا ہے، اور لوگوں کو گھر بیٹھے منیٰ و عرفات، صفا و مروہ اور مدینہ کی گلیوں کے اسی طرح سے عالم تخیل میں پھیرے کرا دیتا ہے جیسے خود اقبال نے "ارمغان حجاز" کے خیالی سفر میں کئے تھے۔

ہمارے علم و تجربہ میں (اور راقم سطور اس کا شاہد عینی ہے) مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی ان صفات کے (جن کو بہت سے لوگوں نے متضاد سمجھا ہے) جامع تھے، اور اس مشہور شعر کے مصداق ؎

در کفے جام شریعت در کفے سندان عشق

ہر ہوسناکے نداند جام و سندان باختن

انہوں نے اسی جذب و شوق کے پروں سے اڑ کر (جس کی داستان انہوں نے مزے لے لے کر اپنے سفرنامہ حج اور پیش نظر مضمون "دربار نبوت کی حاضری" میں سنائی ہے) ۱۹۲۶ء میں حج بیت اللہ اور زیارت مدینہ کا سفر کیا، پھر چونکہ اللہ نے ان کو عشق کے ساتھ علم اور قلب کے ساتھ قلم بھی دیا ہے اس سفر کی حکایت عاشقانہ

و مورخانہ انداز میں نہیں بلکہ عاشقانہ اور مستانہ لیے میں، مگر علم و ادب کی چاشنی اور شرعی و فقہی بصیرت اور تفسیری و حدیثی نکات و تحقیقات کے ساتھ اُن لوگوں کو سُنائی ہے جن کو ابھی تک یہ سعادت نصیب نہیں ہوئی یا نصیب ہوئی ہے لیکن کسی محرم عقل و عشق کی زبانی وہ سننا چاہتے ہیں۔ میں نے یہ مضمون اُسی زمانے میں پڑھا تھا جب یہ پہلی بار "الفرقان" کے ج نمبر میں ۱۳۶۹ھ میں شائع ہوا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ مدینہ طیبہ کے طویل قیام میں جب میں "جامعہ اسلامیہ" کے خطبات کے لیے ٹھہرا ہوا تھا، ایک دن طبیعت میں کچھ بے کیفی محسوس ہوئی اور دل کا تقاضا ہوا کہ اس میں تحریک پیدا کرنے والی کوئی نظم ملے، میں نے کہیں سے "الفرقان" کا وہ نمبر حاصل کر لیا اس میں ان کی لگدھی یا ہماری زبان کی نعت شائع ہوئی ہے، جس کا مطلع ہے ؎

پیارے محمد جگ کے سجن — تم پر واروں تن من دھن
تمری صورتیا من موہن — کبھو کرا ہو تم درشن
جیا کنھر ٹے — دلوا ترسے
کر یا کے بدوا — کبھیا برسے

خوب یاد ہے کہ جب یہ شعر پڑھے

تمری دوار یا کیسے چھوڑوں — تم سے توڑوں تو کس سے جوڑوں
تمری گلی کی دھول بٹوروں — تمرے نگر میں دم بھی توڑوں

جی کا اب ارمان یہی ہے
آٹھوں پہر اب دھیان یہی ہے

ان اشعار کا پڑھنا تھا کہ سوئی ہوئی طبیعت جاگ اٹھی اور ایسا معلوم ہوا کہ کھوئی ہوئی چیز مل گئی، میں سمجھتا ہوں کہ بیسیوں آدمیوں کو اس نعت کے پڑھنے سے اسی طرح کا فائدہ حاصل ہوا ہوگا۔

اسی طرح ان کے اس مضمون سے دریائے شوق اور حبِ رسول میں اگر تلاطم نہیں تو تموج ضرور پیدا ہوا ہوگا اور یہ کوئی معمولی بات اور کوئی ارزاں اور حقیر یافت نہیں ہے، اس کے بغیر دل ویران اور زندگی سوختہ ہے اور اگر کوئی طویل وقت اس لذت و عزت کے بغیر گزر جائے تو وہ عمر میں شمار ہونے کے قابل نہیں، امیر خسروؒ نے اسی حقیقت کو اپنے خاص انداز میں بیان کیا ہے ؎

ناخوش آں وقتے کہ بر زندہ دلاں بے عشق رفت
ضائع آں روزے کہ بر مستاں بہ ہشیاری گزشت

حج کے سفرنامے اور مدینہ طیبہ کی حاضری کی رودادیں تو اردو میں بہت ہیں اور ایک سے ایک بڑھ کر دلچسپ و پر از معلومات، مفید اور سفر کرنے والوں کے لئے ضروری لیکن یہ البیلا طرز بیان اور یہ عاشقانہ و مستانہ داستان آپ کو ہر جگہ نہیں ملے گی، کہ یہ مولانا کا طرز خاص ہے اور کم سے کم اس موضوع کے لئے یہ طرز ضرور مناسب اور مفید ہے کہ شوق انگیز بھی ہے اور ولولہ خیز بھی، اور اسی کے ساتھ علم آموز بھی اور خیال افروز بھی، عازمین حج و زیارت کی خدمت میں مخلصانہ مشورہ ہے کہ وہ وہاں کی حاضری سے پہلے اس کو ضرور پڑھ لیں، اور اپنے اندر وہاں کی حاضری سے پہلے حاضری کا شوق اور اس مقام کا ادب و احترام اور اس کا مرتبہ و مقام سمجھ لیں، اور کوشش کریں کہ جس کے متعلق عزت بخاری نے کہا ہے ؎ نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا!

وہاں کے لئے اسی طرح اندرونی طور پر تیار ہو کر جائیں؛ جس طرح سفر کو سہولت و راحت کے ساتھ طے کرنے اور حج و زیارت کو صحیح طور پر ادا کرنے کے لئے (فقہی کتابوں اور سفرناموں کے ذریعہ) بیرونی طور پر تیار ہو کر جاتے ہیں۔ امید ہے کہ یہ مختصر سا سفرنامہ اور مدینہ طیبہ کی حاضری و قیام کے مشاہدات و تاثرات کی روداد اس مقصد کے لئے مفید و معاون ثابت ہوگی۔

ابوالحسن علی۔ ۳؍ ذی الحجۃ الحرام ۱۳۹۹ھ (لکھنؤ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

از بخت بدم اگر فروشد خورشید
از نور رخت مہا چراغے گیرم

جون ۱۹۲۷ء میں ٹھیک ان ہی دنوں میں جب بہ سلسلۂ تعطیل موسم گرما فقیر
اپنے وطن گیلانی (بہار) میں تھا، ایک ایسی بیماری میں مبتلا ہوا یا مبتلا کیا گیا جس
کے خیال سے بھی دیکھنے والے شاید اب بھی کانپ جاتے ہوں، ایک مولوی اور
لوگوں میں نیک نام مولوی، جامعہ عثمانیہ کا پروفیسر، دکن کا واعظِ شہر، ایک
پر لطف تماشا تھا کہ بجائے خون کے اس کے جسم میں ریم اور پیپ کا طوفان
اُبلنے لگا۔ باہر سے جلد پر پھنسی کا اثر بھی معلوم نہیں ہوتا تھا، لیکن اندر ہی اندر
ایسے ایسے بڑے زخم اور پھوڑے پیدا ہو گئے، جن سے آپریشن کے
بعد میں نے خود تو نہیں دیکھا لیکن سنا کہ تین تین سیر تک پیپ نکلی، بخار
چار پانچ ڈگری تک پہنچ جاتا تھا، اسی سے دماغ عموماً معطل رہتا تھا،
حالانکہ دونوں ہاتھ، دونوں پاؤں، ران، پشت، الغرض ایک ایک

عضو داغدار تھا، اور ایسے داغوں سے داغدار تھا، جن کا علم دوسروں کو صرف آپریشن کے بعد ہوا، لیکن اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جو ان نہانی زخموں کے انگاروں پر لوٹ رہا تھا، اس کا حال کیا ہوگا؟ مگر سبقت رحمتی علی غضبی کی شاید ایک شکل یہ بھی تھی کہ دماغی تعطل نے تکلیف کی شدت کے احساس کو ایک حد تک کند کر رکھا تھا، چالیس دن تک مختلف امراض کے شبہات وشکوک کے تحت اطباء وڈاکٹروں کا تختۂ مشق اپنے گاؤں گیلانی ہی میں بنا رہا، مگر ایک ڈاکٹر جو بحمداللہ! ابھی زندہ ہیں، انہوں نے ابتداء ہی میں مرض کی صحیح تشخیص کر لی تھی کہ نقیح الدم یا پامیا کی بیماری ہے۔ دوسرے اطباء اور ڈاکٹروں کو انہوں نے زبردستی الگ کر دیا۔ اور اپنے اختیلی تیزی سے گویا یوں سمجھئے کہ انہوں نے اپنے زیر علاج ہی رکھا[1] جب یہ اندرونی پھوڑے پک گئے، تب انہوں نے مشورہ دیا کہ دیہات میں اس قسم کے پھوڑوں کا آپریشن ناممکن ہے پٹنہ کا شہر قریب ترین شہر تھا، جہاں جنرل اسپتال کی آسانی تھی طے کیا گیا کہ مجھے پٹنہ پہنچایا جائے، مگر ایسے بیمار کو کیسے پہنچایا جائے جس کے دونوں ہاتھ بھی بے کار، دونوں پاؤں بھی بے کار، حتیٰ کہ پشت پر سونے کا مطلب جس کے لئے یہ تھا کہ زخموں پر پڑا رہے، ایسے بیمار کی منتقلی

---

[1] ان کا اسم گرامی ڈاکٹر زاہد خاں ہے آج کل شیخپورہ (ضلع مونگیر) میں خانگی پریکٹس کرتے ہیں۔

کا مسئلہ کافی دشوار تھا۔

ایک کھٹولے کو موٹر میں، موٹر سے ریل میں، لوگ جنازے یا تابوت کی طرح منتقل کر رہے تھے، کیول جنکشن پر ایک گاڑی سے دوسری گاڑی میں یہی کھٹولا جب قلیوں کے کندھوں پر منتقل ہو رہا تھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک مرے ہوئے کتے کو پھینکنے کے لئے لوگ لے جا رہے ہیں۔ بہرحال پٹنہ یہی کھٹولا بیمار کے ساتھ پہنچا۔ ہسپتال میں داخل ہوا، ڈھائی مہینے کی مدت میں سات آپریشن مختلف اعضاء پر کئے گئے، تماشا یہ تھا کہ آپریشن کر کے مواد ایک عضو سے جب ڈاکٹر خارج کرتے تھے، تو دو تین دن کے وقفہ کے بعد کسی دوسرے عضو میں ٹیس اور درد کا زور شروع ہوتا، اور یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہتا، تا اینکہ ساتویں آپریشن کے بعد پاؤں کے ایک حصہ میں پھر درد اور ٹیس کی کیفیت شروع ہوئی، گویا آٹھویں آپریشن کی تمہید شروع ہو چکی تھی کہ پھر کیا ہوا؟ اسے اب کیا بتاؤں؟ بخاری شریف کی روایت جس کا حاصل یہ ہے کہ:-

مرگیا ایک حبشی (راوی کہتا ہے کہ) یا حبشیہ، لوگوں نے اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطلاع کے بغیر دفن کر دیا۔ رسول اللہؐ نے اس کے متعلق دریافت فرمایا تو عرض کیا گیا کہ یا رسولؐ اللہ اس کا تو انتقال ہو گیا، یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے کیوں اطلاع نہ دی گئی؟ تب لوگوں نے
کچھ اِدھر اُدھر کی باتیں کیں۔ راوی کا بیان ہے کہ اس (مرنے
والے مسلمان) کو ہیچ میرز قرار دیا۔ یعنی فقیر، مگر رسول اللہ صلی
اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کی قبر مجھے بتاؤ کہ کہاں ہے؟ قبر
کی نشان دہی کی گئی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس (ہیچ میرز
غریب مسلمان) کی قبر پر تشریف لائے اور قبر ہی پر اس کی آپؐ
نے نماز پڑھی (یعنی جنازے کی نماز پڑھی)"

(بخاری جلد ۱ ص۱۷۸ مجتبائی)

شاید کچھ اسی قسم کے واقعات کی طرف اشارہ کیا ہے کہنے والے نے اس مشہور
شعر میں ؎

دو عالم بہ کاکل گرفتار داری ۔ بہ ہر مو ہزاراں سیہ کار داری
ز سر تا بپا رحمتی یا محمدؐ ۔ نظر جانب ہر گنہ گار داری

صبح ہوئی، عجیب صبح تھی، یہ دیکھنے کے لئے کہ پاؤں کا زخم پک کر آپریشن
کے قابل ہو چکا؟ ڈاکٹر آئے، آکر جہاں درد اور ٹیس کی کیفیت تھی ہاتھ رکھا
گیا، جو نشتر کی نوک کو تیز کرتے ہوئے آئے تھے، متحیر ہو کر پوچھ رہے تھے کہ قصہ
کیا ہوا؟ پھوڑا کہاں پر تھا؟ وہ ڈھونڈ رہے تھے اور نہیں ملتا تھا، مریض خستہ
جسم و جاں سے پوچھا جا رہا تھا اور وہ خاموش تھا، آخر اس فیصلہ پر مجبور ہوتے

کہ آٹھویں آپریشن کی ضرورت باقی نہ رہی، کیوں باقی نہ رہی؟ یہ ایک راز تھا جس سے نہ اس وقت وہ واقف ہوئے اور نہ ہو سکتے تھے، سیہ کار پر نظر رحمت پڑ چکی تھی، کالے حقیر سمجھے جانے والے حبشی کی ڈھیر پر کھڑے ہو کر عالمین کی جس رحمت نے دعا کی تھی، مغفرت کی دعا کی تھی، مغفرت کی وہی دعا آج ایک سیاہ کار کے لئے کارگر ثابت ہوئی۔

ہر ہر عضو گرا ہوا تھا، چلنا پھرنا تو دور کی بات ہے، قسم ہے اسی خدائے زندہ و توانائی، جو مُردوں سے زندوں کو اور زندوں سے مُردوں کو نکالتا ہے کہ ایک سیکنڈ دو سیکنڈ کے لئے ابھی بیٹھنے کی آرزو جس سیاہ بخت کے لئے مہینوں سے صرف آرزو بنی ہوئی تھی، بخت کی بیداری کے بعد دیکھا جا رہا تھا کہ اب وہ اٹھ رہا ہے اٹھتا چلا جا رہا ہے، جس کی موت کا فیصلہ کیا جا چکا تھا، وہ دوبارہ گویا زندوں میں پھر شریک کر دیا گیا۔ ہسپتال والوں نے چند ہی دنوں بعد حکم دے دیا کہ اب یہاں رہنے کی ضرورت نہیں ہے، حکم کی تعمیل کی گئی، پھر آگے کیا قصے پیش آئے ان کی تفصیل غیر ضروری ہے، شعور اور احساس میں ایک خیال کے سوا دوسرا خیال، یا ایک جذبے کے سوا دوسرا کوئی جذبہ باقی نہ رہا تھا، اس زمانے میں میں بہار میں تھا، بہار کی دیسی آبادی جو دیہاتوں میں رہتی ہے ایک خاص قسم کی زبان بولتی ہے، اس زبان میں اور کچھ ہو یا نہ ہو، لیکن التجا و التماس کے لئے اس کا پیرایہ حد سے زیادہ موزوں اور مناسب ہے، بے ساختہ اسی زبان میں کچھ مصرعے ابلنے لگے، سن کر تو اردو زبان کے

سمجھنے والے بھی اس کو شاید سمجھتے ہیں لیکن اردو زبان کے املائی حدود میں مگدھی یا بہاری زبان مروجہ کے ان الفاظ کو لانا دشوار ہے، کتابی شکل میں صحیح طور پر جیسا کہ چاہیئے شاید وہ سمجھے بھی نہیں جاسکتے لیکن عرض چونکہ اسی زبان میں کیا گیا تھا، بجنسہ ان ہی الفاظ کو نقل کر دیتا ہوں۔ وہو ہذا:۔

پیارے محمدؐ جگ کے سجن تم پر واروں تن من دھن
تمری صورتیا من موہن کبہیو کرا ہو تو درشن
کبھی کرا دیجئے ۱۲

جیسا کنھرے، دلوا ترسے
کڑھتا ہے ۱۲ دل ۱۲
کرپا کے بدرا کبہیا برسے
بادل ۱۲ کب ۱۲

تمری دوآریا کیسے چھوڑوں تم سے توڑوں تو کس سے جوڑوں
تمری گلی کی دھول بٹوروں تمرے نگر میں دم بھی توڑوں۔

جی کا اب ارمان یہی ہے
آٹھوں پہر اب دھیان یہی ہے

صلی اللہ علیک نبیا تمرے دوارے آیا دکھیا
بہنیا اہکی پکڑہو راجا اپنے حسین و حسن کا صدقا
بازو اس کا پکڑ لے اے راجہ ۱۲

ڈھوا گھیریں ناؤ کو اس کے
موج عظیم ۱۲

اب نہیں ہم ہیں اپنے بس کے

سیس پہ اپکے پاواں دھر ہو پیت کی اگیا من میں بھر ہو
سر ۱۲ پاؤں ۱۲ محبت ۱۲

بھدر ہوا پہ تنی کر پا کر ہو سپنو میں ایسن کر گجر ھو
حد سے زیادہ منحوس و بدبخت ذرا مہربانی کیجیے خواب میں ہی ایسا گجر گذر رہے

راجا تمری دیوڑھی بڑی ہے

رحمت تمرے نام پڑی ہے

اندھرا کے تم رہیا بتا ہو ہردے کا اپکے جوت جگا ہو
اندھے کو بتا یئے ۱۲ قوی باطنی ۱۲

ڈگری پہ اپنے اپکو چلا ہو بودھا کے تم بدّھی بنا ہو
راستہ ۱۲ بے وقوف کو آپ دانش مند بنا دیجیے

کھینچو اپکو پاپ نرک سے

دھو دیہو کا لیکھ منھ کا اپکے
سیاہی

تمرے پیا کی اونچی اٹریا ہمری نے ہی واں پہ گجریا
بتلا بتلا رہی نجریا پکھلی ہے اک تمری دواریا
بھٹک بھٹک کر رہی نظر دیکھی ہوئی ہے ۱۲

اُن کھر پتوا تمرے سے چلی ہے
ان کا پتہ تم سے چلے گا

کھوجوا ابھی ان کا تمرے سے ملی ہے
سراغ ان کا آپ ہی سے ملے گا

پی کی پتیا تم ہی سے لیو ان کھر بتیا تم ہی سنی لیو
محبوب کا خط آپ ہی لائے ان کی باتیں آپ ہی نے سنائیں

ہمنی سے نندیا سے تم جگے لیو مرل تھلبق تم ہی سجلے لیو
ہم لوگوں کو نیند سے آپ ہی نے جگایا مرے ہوئے تھے تم ہی نے جلایا

دھرمی بھے لوں تم ری دیا سے
مومن ہوتے " تمہاری مہربانی سے

مکتی بھی ہوا ای ہی تمری ودوا سے
نجات بھی ہوگی آپ ہی کی دعا سے

" ورشن " کی آرزو اس عجیب وغریب اضطراری نظم کی روح تھی، بہار کے نائب امیر شریعت مولانا سجاد مرحوم اگرچہ بہ ظاہر فقیہ النفس والصورت تھے، مگر ذاتی تجربے کے بعد یہ ماننا پڑتا تھا کہ باطن اِن کا فقیہ سے زیادہ فقیر تھا۔ قرابت کے تعلقات کی وجہ سے گیلان بھی تشریف لاتے تھے، اسی زمانے میں اتفاقاً ان کی تشریف آوری ہوئی، اس نظم کے سننے کا موقعہ ان کو بھی ملا، سنتے جاتے تھے اور روتے جاتے تھے، خصوصیت کے ساتھ اس بند پر تڑپ تڑپ گئے، ہچکیاں ان کی بندھ گئیں، یعنی دوسرا بند سے

تمری دوار یا کیسے چھوڑدوں — تم سے توڑوں تو کس سے جوڑوں
تمری گلی کی دھول بٹوروں — تم رے نگر میں دم بھی توڑوں
جی کا اب ارمان یہی ہے
آٹھوں پہراب دھیان یہی ہے

"تم سے توڑوں تو کس سے جوڑوں"؟ اس استفہامی مصرعہ کو بار بار دہراتے اور بے قرار ہوکر بلبلاتے، اور ہے بھی یہ سوال کچھ اسی قسم کا، آج انسانیت زمین کے اس خاکی کرے پر تڑپ رہی ہے، زندگی کا مطلب کیا ہے؟ اس سوال کو حل کرنا چاہتی ہے، ایک ڈیوڑھی کے سوا خود ہی سوچیے کہ دنیا میں کون سا آستانہ ایسا باقی رہا ہے جہاں واقعی اس سوال کے جواب کی صحیح توقع کی جائے؟ اس تنہا، واحد آستانے سے ٹوٹنے والا خود سوچے کہ کہاں جائے گا۔ کن کے پاس جائے گا؟ موسیٰؑ ہوں یا عیسیٰؑ، ابراہیمؑ ہوں یا یعقوبؑ علیہم السلام یا ان کے سوا کوئی اور، اس راہ کے ان سب راہبروں نے اپنے اپنے وقتوں میں جو راہ پیش کی تھی۔ جب وہ ساری راہیں مسدود ہو چکی ہیں، تاریخ جانتی ہے کہ ڈھونڈھنے والوں کو ان بزرگوں کی بتائی ہوئی راہ نہیں مل سکتی تو اب دنیا کہاں جائے اور اس کے سوا کہ ع

جلوۂ ات تعبیر خواب زندگی (اقبال)

کا فیصلہ کرتے ہوئے "تم سے توڑوں تو کس سے جوڑوں" ؟ کہتا ہوا اسی چوکھٹ کے ساتھ چمٹ جاتے، جس کے سوا شہادت والوں کو غیب تک پہونچنے اور پہونچانے کا کوئی دوسرا ذریعہ باقی نہیں رہا ہے۔

بہر حال ہسپتال سے نکلنے کے بعد ڈاکٹروں کے حسب مشورہ چھوٹا ناگپور کے شہر ہزاری باغ میں کچھ دن گذارے کہ نسبتًا وہاں کا موسم اس زمانے میں ٹھنڈا سمجھا جاتا ہے کہ آب و ہوا وہاں کی عمومًا صحت پرور ہے۔ ہزاری باغ ہی میں پہلے اٹھنے بیٹھنے اور آخر میں کچھ چلنے پھرنے کی قوت بتدریج واپس ملنے لگی، پھر اپنے دیہاتی مستقر گیلانی کی طرف واپس ہو گیا تقریبًا چھ مہینے اس سلسلے میں ختم ہوئے جامعہ عثمانیہ سے اتنے دنوں تک غائب رہا۔ تنخواہ بھی نصف ملتی رہی، اور ڈاکٹری علاج میں مصارف کا غیر معمولی بار عائد ہوا[1] غالبًا جنوری ۱۹۲۸ء میں پھر جامعہ عثمانیہ میں رجوع ہو گیا، اور کام کرنے لگا۔ تقریبًا یہ سال بھی پورا ہوا، مولانا عبد الباری ندوی استاذ جامعہ اور فقیر کچھ دن سے ایک ہی مکان میں رہنے لگے تھے۔ بیماری کے نازک دنوں میں مولانا نے زبانی ہی نہیں بلکہ عملی ہمدردی بھی فرمائی۔ واپسی کے بعد پھر ان ہی کے ساتھ قیام رہا کیوں کہ تعلقات

---

[1] والد مرحوم حافظ سید ابو الخیر فرمایا کرتے تھے کہ ڈاکٹری علاج میں جسم اور روپے کی تھیلی دونوں میں بیک وقت آپریشن کے عمل کی ضرورت ہوتی ہے۔ ۱۲

اس عرصہ میں بہ نسبت پہلے کے اور زیادہ قریب ہو چکے تھے کہ اچانک مولانا نے حج کے ارادے کا اعلان کیا، مولانا نے بھی اعلان کیا اور ان کے بچپن کے رفیق قدیم مولانا عبدالماجد صاحب مدیر صدق کی طرف سے بھی اسی اعلان کے اعادے کی خبریں مجھ تک پہونچنے لگیں تھیں اور گو مولانا عبدالماجد صاحب کے ساتھ رہنے سہنے کا موقع زندگی میں کبھی نہیں ملا، لیکن جن دنوں بیمار رہا تھا، اس سے کچھ پہلے مولانا سے نیازمندی کا رشتہ قائم ہو چکا تھا، پٹنہ ہسپتال میں جب تقریباً بے ہوش پڑا ہوا تھا، اور پہلا آپریشن ہوا تھا، آپریشن کے بعد کچھ خفت محسوس ہوئی آنکھیں کھل گئیں، تو یہ بھی ایک تاریخی واقعہ ہے کہ اپنے سرہانے دیکھتا ہوں کہ دعا میں اٹھائے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ کوئی کھڑا ہوا ہے، اتنا ہوش واپس آچکا تھا، پہچان کر آنکھوں میں آنسو بھر گئے کہ ہمارے کرم فرما مولانا عبدالماجد صاحب مدیر صدق ہیں۔ ع

باہم نگریستم گذشتیم

گویا حیات بعد الموت کے بعد پہلی نظر ان ہی پر پڑی یہی مقدر ہو چکا تھا، میری علالت کی تشویشناک خبروں سے بے چین ہو کر مولانا پٹنہ میری عیادت کے لئے تشریف لے آئے تھے۔

الغرض علالت کے اس دوران میں منجملہ دوسری نعمتوں کے ایک اس غیر مترقبہ نعمت سے بھی سرفرازی ہوئی کہ مولانا عبدالماجد اور مولانا عبدالباری ان دونوں بزرگوں کے ساتھ روابط میں غیر معمولی استحکام و استواری پیدا ہوگئی اور امید اسی کی ہے کہ ان بزرگوں کی ذرہ نوازیوں سے دنیا کے ساتھ "الآخرہ" میں بھی استفادہ کا موقع انشاء اللہ عطا کیا جائے گا کہ ان روابط و روابط کی بنیاد "تقویٰ" پر قائم ہے، ساری خلتیں جس دن عداوتوں سے بدل جائیں گی۔ الا المتقین کو اس عام قانون سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ حیدر آباد کے جس مکان میں خاکسار اور مولانا عبدالباری مقیم تھے، اب اس مکان میں صبح و شام حج اور اس کے مقدمات و تمہیدات کا تذکرہ چھڑا، اور اس طرح چھڑا کہ جیسے جیسے سفر کا زمانہ قریب آتا جاتا تھا اس تذکرے کے سوا دوسرے تذکروں کی گنجائش کم ہوتی جاتی تھی، سامنے یہ قصہ تھا اور اس عرصہ میں مولانا عبدالماجد صاحب کے مکاتیب میں بھی حج ہی کے ارادے اور تیاریوں کا ذکر ہوتا، سمند ناز پر جو مسلسل تازیانے کا کام کر رہا تھا، ہوک دل میں اٹھتی تھی علالت کے طویل سلسلے نے جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے میری مالی حالت کو زبونی کی آخری حدود تک پہنچا دیا تھا، قرض اور دیون کے بار ہی سے پیٹھ جھکی ہوئی تھی، ایسی صورت میں دبی ہوئی آرزو

کے ابھرنے کا موقع کیا تھا؟ مولانا عبدالباری اپنے ملنے جلنے والوں سے جب مسئلہ حج پر گفتگو شروع فرماتے تو ندامت و خجالت کی زردی چہرے پر پھیل جاتی، زبان بھی بند ہو جاتی اور شاید شنوائی کا رشتہ بھی قلب کے ساتھ باقی نہ رہتا، لوگ مختلف مشورے مولانا کو دیتے، یہ کیجئے وہ کیجئے، حج کے پرانے تجربہ کار سفر کے نشیب و فراز اور ضرورتوں سے آگاہ کرتے اور دور پلنگ پر لیٹا ہوا ایک معذور و مجبور صرف کروٹوں پر کروٹیں بدلنے کے سوا کچھ نہ کرتا تھا نہ کچھ کر سکتا تھا۔

دن گزرتے رہے، قصے ہوتے رہے، تا اینکہ شاید ہفتہ عشرہ سے زیادہ وقفہ باقی نہ رہا کہ حیدرآباد سے حج کی رخصت کی کارروائی مکمل کرانے کے بعد مولانا عبدالباری اپنے رفیق کو اسی مکان میں چھوڑ کر روانہ ہو جائیں، ولولے اٹھتے تھے اور دب دب جاتے تھے لیکن وقت کی تنگی اپنے آخری حدود پر پہنچ گئی تھی کہ:۔

اچانک عزم کی بجلی سی تھی جو سینے میں چمک اٹھی، شاید رات کی تاریکی میں اس عزم کا مقدس نور قلب میں پیدا کیا گیا، دوسرے دن وہی جو مہینوں سے اس مسئلہ کے متعلق مولانا عبدالباری کے لئے کچھ اجنبی اجنبی سا بنا ہوا تھا، اسی نے مولانا سے عرض کیا کہ "فرمایئے اپنی ہمرکابی میں اس کو بھی شریک ہونے کی اجازت مل سکتی ہے جس کی شرکت کا بہ ظاہر کوئی ذریعہ سردست پیش نظر

نہیں ہے۔" یہ مولانا کے دل کی بات تھی چونکہ میری طرف سے کسی رجحان کو نہیں پاتے تھے وہ خاموش سے تھے، میرے اس عرض پر شگفتہ ہوگئے، مگر جس تالے کی کنجی گم ہے اس کے کھلنے کی صورت کیا ہوگی؟

اب کیا بتاؤں کہ جس تالے کی کنجی میری ناقص وجاہل عقل کے نزدیک گم شدہ تھی، وہ میرے سامنے کس رنگ میں لائی گئی؟ تفصیل سن کر کیا کیجئے گا "بیدہ الخیر" نے اپنا ہاتھ کھول دیا۔ نہ کسی سے قرض ہی لینا پڑا، اور نہ امداد واعانت کی رسوائی و ذلت کی برداشت کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کرنے پر مجبور ہوا، کسی کو خبر بھی نہیں ہوئی، اسی ہفتہ عشرہ کے تنگ وقت میں ساری کارروائی نیچے سے اوپر تک طے پا گئی، اور ٹھیک جس دن مولانا لکھنو اس لئے روانہ ہوئے کہ والدین کو ساتھ لے کر سفر حج پر روانہ ہو جائیں خاکسار بھی اپنے اعزہ واقربا سے ملنے اور رخصت ہونے کے لئے حیدرآباد سے راہی بہار ہوا، ماہ رمضان المبارک کی آخری تاریخوں میں گھر پہونچا، عید کی نماز پڑھی، اور اہل وطن سے رخصت ہو کر بمبئی کے ارادے سے روانہ ہوگیا، میرے منجھلے بھائی برادرم مکارم احسن گیلانی سلمہ گیا تک بمبئی میل پر سوار کرنے کے لئے ساتھ آئے، صرف ایک دری ایک کمبل دو چادروں کے علاوہ دو تکیے بستر ے میں رکھے گئے، ان تکیوں سے روئی نکال لی گئی تھی، اور یہ ہمارے برادر عزیز مکارم سلمہ کی جدت طرازی تھی کہ روئی کی جگہ ان ہی دو تکیوں میں انہوں نے آٹھ

دس جوڑے کرتوں اور پائجاموں کے اور بنیائن وغیرہ رکھ دیئے۔ اب یہی دونوں تکیے میرے تکیے بھی تھے، اور یہی کپڑوں کا بقچہ بھی، ٹرنک بھی یہی سوٹ کیس بھی، یہ تو مختصر سا بستر اتھا، ایک ٹفن کیریر اور چمڑے کا پورٹ منٹو جیسا ایک بیگ بس یہی کل کائنات سامانِ سفر کی تھی۔

بمبئی میل رات کے تین چار بجے گیا سے روانہ ہوتا ہے، مجھے میرے عزیز بھائی نے ریل کے ڈبے میں بٹھا دیا۔ اور ان کے سینے میں جو دبی ہوئی آواز تھی، گریہ اور بکا کی آواز کے ساتھ مل جل کر نکل رہی تھی، وہ کہہ رہے تھے:۔

"سرکار کے دربار میں جا رہے ہیں اس غریب دور افتادہ امتی کا سلام عرض کر دیجئے گا، اور عرض کر دیجئے گا کہ امت جس حال میں ہے اس کی طرف توجہ فرمائی جائے، ایمان و اسلام کی طرف منسوب ہوتے ہوئے بغاوت پر لوگ آمادہ نظر آ رہے ہیں، عہد وفا بھلایا جا رہا ہے۔"

کچھ یہ اور اسی قسم کی باتیں بے ساختہ رخصت کرتے وقت وہ کہتے جا رہے تھے۔ میرا دل بھی بھر آیا۔ گاڑی نے سیٹی دے دی، اپنے عزیز بھائی کے اس آخری پیغام کے سوا اب دماغ اور دل میں کچھ نہ تھا، گاڑی روانہ ہو گئی، دونوں بھائی ایک دوسرے سے یہ کہتے ہوئے جدا ہو گئے کہ "امت کے بکھرے ہوئے شیرازے کو جس کی دعا سمیٹ سکتی ہے وہاں جا کر کچھ پیروی کیجئے گا،

گڑگڑا ئیے گا، روئیے گا۔"

رات کی تاریک فضا کو بمبئی میل کا دیو ہیکل انجن چیرتا، پھاڑتا، چیختا چلاتا ہوا چلا جا رہا تھا اور اسی طویل گاڑی کے ایک گوشہ میں خدا جانے کن کن آرزوؤں پر لوٹتے ہوئے ایک فقیر بے نوا بمبئی سے قریب ہوتا جا رہا تھا، رات کٹ گئی، دن آیا وہ بھی گذر گیا، پھر رات آئی اور دوسرے دن کی صبح آٹھ بجے وکٹوریہ ٹرمینس پر گاڑی ٹھہر گئی، پلیٹ فارم پر مولانا عبدالماجد صاحب کی جھلک محسوس ہوئی، وہ پہلے تشریف لا چکے تھے، نوازش فرمائی تھی کہ جو تنہا آ رہا ہے اس کو اپنے ساتھ شہر لے جائیں، مرحوم مولانا شوکت علی کے ساتھ "خلافت ہاؤس" میں وہ ٹھہرے ہوئے تھے، فقیر کو بھی وہیں لے جا کر اس کمرے میں ٹھہرایا جس میں ہمارے فاضل قدیم دوست مولانا عرفان مرحوم قیام فرما تھے، اب اس وقت یاد نہ رہا کہ بمبئی میں کتنے دن ٹھہرنے پر مجبور رہنا پڑا۔ جہاز کا انتظار تھا، مولانا عبدالباری صاحب بھی لکھنؤ سے تشریف لا چکے تھے، مجھے کچھ خبر نہ ہوئی کہ ٹکٹ کب لیا گیا اور پاسپورٹ کی کارروائی کب ہوئی، کیسے ہوئی، بظاہر شاید آٹھ دس دن بمبئی میں قیام رہا، کھانا دونوں وقت مولانا شوکت علی مرحوم کے ساتھ ہم لوگ کھاتے رہے۔ ٹونک کے ایک پرانے

ملنے والے مولانا ریاض الور بمبئی جمعیت العلماء کے رکن خاص تھے، اور کسی مسجد میں جس کا نام اب یاد نہ رہا اسی میں مولانا ریاض النور کا قیام تھا، کبھی کبھی ان سے ملنے چلا جاتا تھا، انہوں نے میرے ساتھ یہ دیکھ کر پان کا عادی ہوں، چند سیر گنگا (بھوپال والا) بنوا کر یہ کہتے ہوئے حوالے کر دیا کہ حجاز میں پان نہ ملے گا، اس وقت یہی گٹکا مغتنم ثابت ہوگا، سامان سفر میں ٹفن کیریر جو تھا بمبئی ہی میں اسے چھوڑ دیا گیا اور بجائے اس کے ایک کیمپ کاٹ جہاز پر لیٹنے پوٹنے کے لئے اور سمندر کے نظارے کے لئے کپڑے کی ایک آرام کرسی خریدی گئی، آخر وقت جہاز میں سوار ہونے کا آگیا، سمندر کا یہ پہلا سفر تھا کیمپ کاٹ اور آرام کرسی خوب کام آئی۔ دس دن جہاز میں گذرے، ملا علی قاری کی کتاب المناسک ساتھ تھی، اسی سے مسائل کا التقاط کر کر کے ان حاجیوں کو بتا دیا جاتا تھا جو پوچھتے تھے، کبھی کبھی رات کی تاریکی میں جہاز کی آخری بالائی سطح پر تنہا چلا جاتا، سامنے سمندر کا پانی اور جگمگاتے تاروں سے بھرے ہوئے آسمان کا سناٹے کے اس عجیب وغریب وقت میں نظارہ، جہاز بڑھتا جا رہا تھا، اس خطہ اور پاک سرزمین کی طرف بڑھتا جا رہا تھا، دل کی گہرائیوں سے جس کے متعلق رہ رہ کر آواز آتی تھی ؎

اے خنک شہرے کہ تو باشی دراں   فرخا شہرے کہ تو باشی دراں

وائے امروزم خوشا فردائے من　　　　مسکن یارست شہر شاہ من

(اقبال مرحوم)

برادر عزیز سلمہ اللہ تعالیٰ کا یاد دلایا ہوا "پیغام" دماغ کی سطح پر پہونچ کر مچلنے لگا۔ بے ساختہ زبان سے مصرعے نکلنے لگے، ابتدا تو مادری زبان اردو ہی سے شروع ہوئی۔

ہر ایک سے ٹکرا کر　　　　ہر شغل سے گھبرا کر

ہر کام سے بچتا کر　　　　ہر فعل سے شرما کر

آمد بدرت بنگر

اے خاتم پیغمبر　　　　صلی اللہ علیہ وسلم

اس کے بعد فارسی کے مصرعوں کا زور بڑھا، نیچے اتر آیا، روشنی میں قلمبند کرنے لگا، خاتمہ عربی کے چند مصرعوں پر ہوا۔ "عرض احسن" کے نام سے یہی نظم موسوم ہوئی، اور پیش کرنے کے لئے "تحفۂ درویش" تیار ہو گیا، مولانا عبدالماجد سے جہاز ہی میں تذکرہ کیا گیا، سنا، کس حال میں سنا، سنانے والے اور سننے والے کے سوا شاید کوئی دوسرا موجود نہ تھا، دل کے حوصلے نکلے، نکالے گئے، دوسرے دن مولانا نے نظم کی نقل مانگ لی، غالباً عدن کے ساحل سے یا جزیرہ قامران (کامران) سے جو ڈاک انہوں نے ہندوستان روانہ کی، اسی میں یہ نظم بھی تھی۔ دلی

سے اس زمانہ میں "ملت" نامی اخبار جعفری صاحب کا نکلتا تھا پیش ہونے سے پہلے ہی شاید یہ نظم "ملت" میں شائع ہوگئی، بعد کو تو خدا جانے کتنی دفعہ طبع ہوئی، طبع ہونے کے ساتھ غائب ہو جاتی ہے، حتّٰی کہ اس وقت بجز اس مکتوبہ مسودہ کے مطبوعہ شکل میں اس نظم کی کوئی کاپی خود پیش کرنے والے کے پاس بھی موجود نہیں ہے[1]

اسی حال میں دن کے بعد رات اور رات کے بعد دن کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری تھا، پیشانی کی آنکھوں کے لئے مسلسل ایک بسیط نظارہ وہی نیلا پانی سمندر کا اور نیلے رنگ کا آسمان، اکتا دینے والا نظارہ تھا، لیکن جہاز جس کا نام غالباً اکبر تھا، شاید ہزار سے اوپر آبادی کو لئے ہوئے پانی پر ایک مستقل گاؤں کی شکل اختیار کئے ہوئے تھا، مولانا عبد الباری اور ان کے والدین مولانا عبد الماجد اور ان کی اہلیہ محترمہ اخت العرفات کے علاوہ حضرت مولانا محمد علی بانی و ناظم ندوۃ العلماء (مونگیر) کے تینوں صاحبزادے مولانا شاہ لطف اللہ مرحوم مولانا نور اللہ، مولانا منت اللہ ان کی والدہ اور ہمشیرہ اس خاص[2] تعلق کی وجہ سے جو حضرت

---

[1] یہ نظم "عرض حسن" کے عنوان سے کتب خانہ الفرقان کی مطبوعہ کتاب "آپ حج کیسے کریں" میں شامل ہے۔ ناشر

[2] تقریباً ایک سال تک حضرت والا کی خانقاہ رحمانیہ مونگیر میں حضرت کے قدموں کے نیچے اس خاکسار کو زندگی کے بڑے مبارک دنوں کے گذارنے کا موقع ملا تھا، ماسوا اس کے (باقی اگلے صفحہ پر)

مولانا محمد علی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ خاکسار رکھتا ہے۔ یہ مجمع وحدت کی شکل میں جہاز پر سمٹا ہوا تھا، گویا ایک مختصر سا قافلہ اکیس آدمیوں کا بن گیا۔ اس کا مادی فائدہ یہ ہوا کہ اکیس آدمیوں کے اس قافلہ میں بعضوں کے پاس فرسٹ کلاس کے بھی ٹکٹ تھے، اور زیادہ تر درجۂ سوم کے ٹکٹ والے تھے، فرسٹ کلاس کے ٹکٹ والوں کے طفیل میں تھرڈ کلاس والوں کو عرشہ پر قیام کا بھی موقع ملا اور درجۂ اول کے بیت الخلاء غسل خانہ کے استعمال کا بھی حق حاصل ہوا، یہ بھی ہوتا کہ فرسٹ کلاس والوں کے کیبن (کمرے) کے استعمال کی ضرورت اکیس آدمیوں کے اس قافلے میں کسی کو اگر ہو جاتی، تو اس اجتماعی شکل کا فائدہ یہی تھا کہ ضرورت پوری ہو جاتی یعنی فرسٹ کلاس کے ٹکٹ والے صاحب عرشہ پر چلے آتے اور اپنی

(بقیہ صفحہ گذشتہ) حضرت کے بڑے صاحبزادے مولانا لطف اللہ مرحوم سے برادری کا تعلق بھی پیدا ہو چکا تھا، میری چھوٹی ہمشیرہ ان سے منسوب ہوئیں، مولانا لطف اللہ مرحوم پر حج وزیارت کا ذوق اس کے بعد اتنی شدت کے ساتھ طاری ہوا کہ اس سفر کے بعد انہوں نے دو سفر حجاز کے اور بھی کیے، آخری حج میں تو اپنے اہل وعیال کے ساتھ سال بھر تک حجاز میں قیام فرمایا، کچھ دن مکے میں اور کچھ مدینے میں گذارے، ہندوستان واپس ہوئے تو عمر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور شاید ان کی جوانی بھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ خاکی زندگی کی مدت ختم ہو گئی۔ فغفر اللہ لہ ۱۲

جگہ تھرڈ کلاس والے صاحب کو بھیج دیتے، عرشہ میں کیمپ کارٹ کھٹولے سے خوب مدد ملی۔

اس جہازی بستی کے باشندوں کے لئے ایک ہی مسجد کا انتظام تو ممکن نہ ہوسکا، مگر جماعت کی نماز متفرق جگہوں پہ ہوتی رہتی تھی، ایک ٹکڑی کی امامت کا فرض بھی فقیر کے سر تھوپا گیا اور جہاز میں چند موتیں بھی ہوئیں ان کے جنازے کی نماز بھی اپنے پیشۂ ملائیت کی وجہ سے فقیر ہی نے پڑھائی، اسی سلسلے میں بجائے مٹی کے پانی میں دفن ہونے کا تماشا بھی دکھایا گیا، مرنے والے مرحوموں کے پاؤں میں کوئی وزنی چیز (پتھر یا لوہا) ڈال دیا جاتا تھا اور ایک چکنے تختے پر کفن پہنائی ہوئی لاش رکھ دی جاتی جو آسانی کے ساتھ سرک کر پانی میں چلی جاتی، جہازی بستی کے اس آبی قبرستان کا نظارہ بڑا دردناک تھا، بحالت مسافرت گھر سے دور اجنبیوں کے درمیان دنیا کے قیام کی مدت پوری کرکر کے لوگ سمندر کی تاریک وعمیق گہرائیوں سے "عالم نور" کی طرف روانہ ہو رہے تھے، مرنے والوں کو ان کی آبی قبروں میں سلاتے ہوئے بڑھنے والے آگے بڑھتے جاتے تھے۔

حالانکہ ہفتہ دن سے زیادہ مدت نہ گذری تھی، لیکن جانتے ہیں

جی جس چیز کو دیکھنے کے لئے سب سے زیادہ بے چین تھا وہ زمین کی مٹی تھی، وہی مٹی جس پر برسوں چلتے پھرتے رہے، اسی سے نکلے، اسی پر زندگی بخشی گئی، اسی پر سوتے اور اسی پر جاگتے تھے، خطرہ بھی اس کا دل پر نہیں گزرا تھا کہ جیسے پیاسا پانی کے لئے ترس جاتا ہے، ایسا وقت بھی اسی زمینی زندگی میں آئے گا کہ ہم مٹی کو دیکھنے کے لئے ترسیں گے، مگر ترسے اور خوب ترسے، یہ ہفتہ مٹی پر نہیں بلکہ پانی پر گزرا، اسی پانی پر جس کے نیچے مٹی تھی، مگر میرے لئے تو صرف پانی ہی پانی تھا، عجب پانی! آنکھوں سے جب تک دیکھیے وہ پانی تھا، مگر ہاتھوں سے چھونے کے بعد معلوم ہوتا تھا کہ شاید گوند ہے جو پانی میں گھول دیا گیا ہے، اور زبان پر رکھنے کے ساتھ ہی نہ پوچھیے کہ ذائقہ کی قوت اس پانی کو کیا پاتی تھی، "تلخ نمک کا محلول" حیرت ہوتی تھی کہ اس کڑوے کسیلے، غلیظ گاڑھے پانی کو ہمارے گھروں تک خوش مزہ، شیریں، صاف و پاک، خنک بنا کر کیسے پہونچایا جاتا ہے۔ سمندر کے اسی تلخ و تند پانی کو ہر قسم کی آلائشوں اور ناگوار عناصر سے پاک و صاف کر کے انسانی آبادیوں پر الٹنے والا ہر سال کس طرح الٹتا ہے، کیسے الٹتا ہے؟ قدرت کے ہاتھوں کا یہی الٹا ہوا سمندری پانی جو بمبئی میں جہاز کی ٹنکیوں میں بھر اگیا تھا، جب ختم ہو گیا، تو انسانی ہاتھوں کے بنائے ہوئے میکانیکی آلات سے سمندر کے

اس تلخ و تند پانی کو صاف کیا گیا، اور جہازی بستی کے آباد کاروں میں یہی پانی تقسیم ہونے لگا۔ اس میں شک نہیں کہ ناگوار عناصر سے تو شاید یہ پانی پاک ہوگیا تھا لیکن "گوارائی" کی ایجابی کیفیت سے پھر بھی محروم تھا، پیاس تو اس سے بجھ جاتی تھی، لیکن جی نہیں بھرتا تھا، اس وقت بھی یہی سمجھ میں آیا کہ "قرآن کسی انسان کا مصنوعی کلام نہیں بلکہ قدرتی کلام ہے۔" اس دعویٰ کو پیش کرتے ہوئے یہ مطالبہ جو کیا گیا ہے کہ "اس جیسا کلام لاؤ" تو قدرتی اور مصنوعی چیزوں میں امتیاز کا اس کے سوا اور معیار ہی کیا ہو سکتا تھا۔

بہرحال مصنوعی ہی سہی لیکن پانی کی پیاس اس مصنوعی صاف کئے ہوئے پانی سے بجھی رہتی تھی، لیکن اس آبی قلمرو میں پہونچ کر مٹی یا خاک دھول کی نئی پیاس کا نیا تجربہ جو پیش آیا تھا اس کے بجھنے بجھانے کی کوئی صورت غالباً ایک ہفتہ تک سامنے نہ آئی کہ یکایک بعض دوربین نگاہ والوں کی طرف سے ہنگامہ شروع ہوا کہ افریقہ کی سمت میں کچھ دھندلے دھندلے سے دخانی سائے دکھائی دے رہے ہیں جہاز کی آبی آبادی میں غل مچ گیا، جو تھا اسی دھندلے دھندلے سائے کی جستجو اور تلاش میں منہمک ہوگیا، گویا ساری آبادی جہاز کے ایک ہی حصہ کی طرف پلی اور دھنسی چلی جاتی تھی۔ تب معلوم ہوا کہ مٹی

اور ریت، خاک دھول کی جو نئی پیاس مجھے تڑپا رہی تھی اس پیاس کا تنہا شکار میں ہی نہ تھا، یہ کیا ہے؟ کوئی پہاڑ ہے، کوئی ٹیلا ہے، یا صرف آنکھ کا دھوکا ہے؟ طرح طرح کے وسوسے تھے، خیالات تھے جو مختلف دماغوں اور دلوں میں پیدا ہوتے تھے اپنے اپنے احساس کا اظہار ہر ایک کر رہا تھا، سنائی کا شعر ہے

آب چوں کم شود بجاں جویند　　　　چو بیابند کوں از وشوئند

اس وقت بجائے پانی کے مٹی پر منطبق ہو رہا تھا، نعمت کی قدر نعمت کے زوال کے بعد ہوتی ہے، آج مٹی اور دھول بھی اسی نعمت زائلہ کی شکل اختیار کئے ہوئے تھی، خدا خدا کر کے دھوکے کا بادل پھٹا اور پانی سے دور بہت دور، واقعی ساحل کی کیچڑ کا کچھ حصہ چہرے سے نقاب الٹتے ہوئے بشارت کا پیغام مٹی کے ان پیاسوں کے لئے بننے لگا۔

شور بلند ہوا کہ "کامران کا جزیرہ آرہا ہے، یہ عرب کے علاقہ یمن سے تعلق رکھنے والا عربی جزیرہ تھا، یہ بھی معلوم ہوا کہ قرنطینہ کے لئے اسی جزیرہ میں جہاز والوں کو اتارا جائے گا اوروں کا تو حال معلوم نہیں، لیکن جس خاک سے پیدا ہوئے تھے اس کے فراق کی یہ مدت اپنے لئے ہی ناقابل برداشت بنتی جارہی تھی، گونہ اطمینان ہوا کہ

قسطنطنیہ ہی کے لئے سہی مگر زمین کے دیکھنے کا موقع تو میسر آئے گا اور اس سے بھی زیادہ تحت الشعور شاید ایک اور جذبہ بھی مخفی تھا، واقعہ یہ ہے کہ زمین کے کرّے میں تعدد کا خیال ان ناموں کی وجہ سے جو پیدا ہو گیا ہے جن سے زمین کے مختلف حصوں کو لوگوں نے موسوم کر رکھا ہے، ایشیا، یورپ امریکہ و افریقہ، یا ہند، چین، ایران و مصر وغیرہ ظاہر ہے کہ یہ صرف اصطلاحی باتیں ہیں اور واقعے میں خاک کا ایک تودہ ہے جس میں کہیں کہیں پہاڑ، کہیں پانی کے بڑے ذخیرے پائے جاتے ہیں، لوگوں نے یہ یا اسی قسم کی چیزوں کو حد بنا کر فرض کر لیا ہے کہ فلاں نام والے ملک کی سرحد اس پر ختم ہو جاتی ہے یا فلاں حد سے شروع ہوتی ہے، جغرافیہ کے اٹلسوں میں ان ہی فرضی حدود کے اندر گھرے ہوئے ارضی حصوں کو مختلف رنگوں سے رنگین کر دیا جاتا ہے۔ واقعہ کی کل نوعیت اتنی ہی ہے لیکن سیاسی اغراض کی تکمیل کے لئے لوگوں نے ان فرضی بلکہ وہمی حدود میں اتنی اہمیت پیدا کر دی ہے کہ دنیا ان ہی وہمی اور فرضی حدود کے احترام و سالمیت کے لئے اپنا سب کچھ قربان کرنے پر آمادہ ہو گئی، محبت و عداوت کے واقعی جذبات کے چند اساسی محوروں میں ایک بڑا اہم محور وہم کی یہی پیداوار ہے، اور کچھ ایسا سمجھا دیا گیا ہے کہ جیسے لفظوں میں چین کا لفظ ہند سے اور ہند کا لفظ عرب کے لفظ سے جدا ہے اسی طرح واقع میں بھی زمین کے یہ علاقے جو ان ناموں سے

موسوم ہیں ایک دوسرے سے جدا اور الگ ہیں، گویا جیسے مریخ کا کرہ زہرہ سے اور زہرہ کا کرہ مشتری سے تعلق رکھتا ہے، وہی تعلق کرۂ زمین کے ان علاقوں میں بھی ہے۔

بہرحال ہے تو اوطان یا ممالک و اقالیم کا یہ قصہ بالکل وہم کا اختلاق، مگر کیا کیجئے کہ بچپن سے ذہن انسانی میں جو باتیں رچا اور بسا دی جاتی ہیں، عقل لاکھ زور مارے لیکن ان کا دل سے نکلنا مشکل ہے۔ تجرید و تفرید میں "نبوت" اور وہ بھی "نبوت کبریٰ" سے بلند منزل پر اور کون ہو سکتا ہے لیکن سیرت کی کتابوں میں اس مشہور واقعہ کا تذکرہ کیا ہی جاتا ہے کہ مکہ سے ایک صاحب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مدینہ منورہ آئے۔ آپ نے مکہ کا حال پوچھا، آنے والے صاحب میں غالباً کچھ شعریت بھی تھی انہوں نے مکہ کی چاندنی راتوں کی بھی چند خصوصیتوں کا تذکرہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کچھ ایسے الفاظ میں کیا کہ راوی کا بیان ہے اِغْرَوْرَقَتْ عَيْنَاہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور فرمایا چپ رہو (سہیلی بر روض)

ہر مسلمان خواہ کسی ملک میں رہتا ہو اس کے کان میں عرب کا ذکر ہوش سنبھالنے سے پہلے گونجنے لگتا ہے، کثرت ذکر غیر معمولی تعلق اس ملک سے پیدا کر دیتی ہے، جس وقت کامران کا ساحل قریب آنے لگا، عرب کے ساتھ تعلق کا بھی غیر معمولی جذبہ

متلاطم ہونے لگا، ساحل کے قریب سمندری چیلیں (سی گل) اڑ رہی تھیں، پرندوں پر بھی شاید ایک ہفتہ کے بعد نظر پڑی تھی، ساحل آگیا شاید کشتیوں میں بیٹھ کر ہم لوگ جزیرے میں اترے اور " بسم اللہ الذی بعزتہ وجلالہ تتم الصالحات " کہتے ہوئے اور یہ سوچتے ہوئے کہ سرزمین عرب پر پہلی دفعہ قدم رکھنے کا موقعہ دیا گیا ہے جی چاہتا تھا کہ بجائے قدم کے سر سے اس پاک زمین کے مس کی سعادت میسر آتی مگر رفقاء سفر کا حجاب مانع ہوا، لوگ قرنطینہ کے قصوں میں تھے اور ایک دیوانہ ادھر سے ادھر چھلانگیں مارتا پھرتا تھا، کیا ٹھکانہ تھا ان ولولوں کا جو اس تصور کے ساتھ دل میں جوش مارتے تھے کہ

"اب میں عرب میں ہوں عرب ہی کے ایک قطعہ پر گھوم پھر رہا ہوں "

دن تو کچھ غسل اور بھپارے وغیرہ کی اصطلاحی مشغولیتوں میں گذرا بڑی خنک اور لطیف تھی وہ رات جو اس جزیرے میں غروب آفتاب کے بعد ہمارے سامنے آئی، یاد پڑتا ہے کہ چاندنی بھی غالباً تھی، تنہائی جب کبھی رات کی اس تاریکی میں میسر آجاتی تھی پھر نہ پوچھئے کہ اس جزیرے کے بالو اور ریت کو کس کس چیز پر ڈالتا تھا " خاک بر سر کن " غم کے موقع کا فعل ہے لیکن آج غایت مسرت ونشاط میں اسی فعل کا اعادہ کرایا جا رہا تھا، کامران کی ٹھنڈی متور ہماری یہ رات گذر گئی، صبح کو آفتاب نکلنے کے بعد غالباً دوسرے دن ہم لوگ اسی جہاز پر

واپس کر دیئے گئے جس سے اتارے گئے تھے، قرنطینہ کی جگہ کامران میں ساحل کے کنارے تھی، کچھ سرکاری مکانات بنے ہوئے تھے، انگریزی حکومت کی طرف سے کچھ حکام یہاں مسلط تھے بظاہر آبادی اندرون جزیرے میں تھی جس کے دیکھنے کا موقعہ نہ ملا۔ غالباً اسی آبادی سے انڈے مرغی اور ضرورت کی دوسری چیزیں لے کر اعراب جزیرہ قافلہ میں آئے ہوئے تھے، سب سے زیادہ حیرت اس پر ہوئی کہ اناناس کے مربے کے بند ڈبے اس جزیرہ میں ۴ر ۴ر یا اس کے قریب ارزاں قیمت پر مل رہے تھے، لوگوں نے خوب لیا اور کھایا، غالباً فرانس میں یہ ڈبے پیک کئے گئے تھے اور اس جزیرے تک میں اتنے ارزاں داموں پر وہ فروخت ہو رہے تھے، خیال آتا ہے کہ انگریزی حکومت کی طرف سے طبی محکمہ کے افسروں میں ایک نوجوان عورت بھی تھی اجنبی مردوں کے ساتھ۔ اس لیڈی ڈاکٹر کو رہنے سہنے کی اجازت جن ماں باپ نے دے رکھی تھی، ان پر افسوس ہوا مگر ناموس کا مسئلہ جن قوموں میں کسی حال میں بھی محل افسوس باقی نہیں رہا ہے، ان پر افسوس کرنے والے ہی شاید مستحق افسوس ہوں۔

جہاز میں پھر لوگ سوار ہو گئے، وہی پانی اور آسمان کا بسیط نظارہ پھر سامنے تھا، دن کے وقت کبھی کبھی نظارے کی اس بساط میں ان مچھلیوں کی وجہ سے جنبش پیدا ہو جاتی تھی، جو چھوٹی چھوٹی چڑیوں کی مانند ہزاروں کی تعداد میں جہاز کے ساتھ ساتھ اڑتی ہوئی دکھائی دیتی تھیں، وہ مچھلیاں اڑیں گی تو کیا!

دراصل مل کر ایک جگہ سے پھاند کر دوسری جگہ پہونچی تھیں۔

بحر احمر جس کا نام دریائے قلزم بھی ہے، جدّہ کا ساحل اسی سمندر کے کنارے ہے، اس کے تنگ ترین دہانہ باب المندب سے جہاز ٹھیک صبح کے وقت پاس ہو رہا تھا۔

عدن کے دیکھنے کا موقعہ نہ ملا، شاید رات کو گذر گیا، یا جہاز اس کے قریب نہ ہوا۔

اسی عرصے میں اچانک جہاز میں ایک نیا چرچا شروع ہوا، لوگ ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ یلملم کا میقات (جہاں سے حجاج احرام باندھتے ہیں) اب آنے والا ہے۔ سمندر ہی میں جہاز یلملم کے سامنے آجائے گا۔ جہاز میں گھنٹی بجے گی اور لوگ احرام باندھنے میں مشغول ہو جائیں گے۔ معلوم ہوا کہ یلملم کا پہاڑ جہاز سے نظر نہیں آتا، جہاز کا کپتان اپنے نقشہ کی بنیاد پر مطلع کرتا ہے۔ خاکسار ان باتوں کو سن رہا تھا۔ دل میں ایک خیال تھا اسے اب تک دبائے چلا جا رہا تھا۔ لیکن اب وقت آگیا کہ فیصلہ کیا جائے عام طور پر یہ:۔

وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ	اور وہ لوگ جنہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا اگر تمہارے پاس (اے پیغمبر) آئیں اور اللہ تعالےٰ سے گناہ کی

وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا (النساء)

مغفرت طلب کریں اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) بھی ان کے لئے مغفرت کے طلب گار ہوں گے تو پائیں گے وہ اللہ کو توبہ قبول کرنے والا بڑا مہربان۔

کی قرآنی آیت کی تلاوت اس وقت لوگ کر دیتے ہیں، جب مدینہ منورہ کی حاضری کا مسئلہ چھیڑا جاتا ہے خدا ہی جانتا ہے کہ مدینہ منورہ کی حاضری کے مسئلہ کا استنباط اس قرآنی نص سے سب سے پہلے کس نے کیا۔ لیکن اس استنباط کو غیر معمولی حسن قبول حاصل ہوا، گویا اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ "جَآءُوْكَ" (آئیں تمہارے پاس) کا یہ مطلب کہ اس کا تعلق صرف اسی زمانہ کے ساتھ محدود نہیں ہے جب روضۂ اطہر سے باہر مدینہ منورہ میں آج سے ساڑھے تیرہ سو سال پہلے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم جلوہ فرما تھے، بلکہ روضۂ طیبہ میں عزلت گزیں ہو جانے کے بعد بھی خدمتِ مبارک میں جو حاضر ہوگا وہ استغفار کے اس قرآنی دستاویز سے مستفید ہو سکتا ہے تو اب اس مطلب کی حیثیت ایک اجتماعی مسئلہ کی ہے، فقہ و حدیث اور مناسک کی ہر وہ کتاب جس میں بھی کسی نہ کسی حیثیت سے مدینہ منورہ کی حاضری کا تذکرہ کیا گیا اس میں اسی اجتماعی تفسیر کے ساتھ اس قرآنی نص کے درج کرنے کا عام رواج ہے۔

اسی اجتماعی "تفسیر" نے شاذ اسی زمانہ میں جب سفر حجاز کی نیت کر چکا تھا، قرآن ہی کی دوسری آیت یعنی :-

وَاِذَا جَآءَكَ الَّذِيْنَ	اور جب آئیں تمہارے پاس وہ لوگ
يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ	جو مانتے ہیں ہماری آیتوں کو، تو کہو
سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ	سلام ہو تم پر، واجب کیا ہے تمہارے
رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ	رب نے اپنے اوپر مہربانی کو (یہ کہ)
اِنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًۢا	جو کرے تم میں سے کوئی بری بات
بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْۢ	نادانی سے پھر پلٹ پڑے (یعنی توبہ
بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ فَاَنَّهٗ	کرے) اس کے بعد اور سنور جائے
غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝	تو وہ بہت بڑا بخشنے والا بہت بڑا
(الانعام)	مہربان ہے۔

سے یہ احساسات قلب میں پیدا ہوئے کہ اس نص قطعی کی رو سے یقینی ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے "السلام علیکم" کی دعا ہر اس شخص کو میسر آتی ہے جو ایمان کے ساتھ آستانہ نبوت کبریٰ پر حاضری کی سعادت حاصل کرتا ہے، اور یہ خبر بھی براہ راست اللہ کے آخری رسول رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے توسط سے اس کو پہنچائی جاتی ہے کہ توبہ و اصلاح کے بعد اپنے مالک کو وہ غفور (بہت بڑا بخشنے والا) اور

رحیم پائے گا۔

سورۃ النساء کی پہلی آیت ہی کے مضمون کا اعادہ الانعام کی اس آیت میں اس اضافے کے ساتھ کیا گیا ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے "سلامتی" کی دعا بھی قطعی طور پر ہر وہ مومن حاصل کرتا ہے جو بارگاہِ نبوت میں حاضر ہوتا ہے۔

امتی سلام عرض کرتا ہے، لیکن برگشتہ بخت سیہ کاروں کو اس سلام کا جواب بھی دیا جاتا ہے اب تک تو حدیثوں ہی سے اس کا ظنی علم پیدا ہوتا تھا مگر سورۃ الانعام کی اس آیت نے اس ظنی علم کو قطعی اور یقینی بنا دیا۔

اس راہ کے بعض خاص افراد سے جہاز ہی میں اپنے اس اندرونی احساس کا اظہار بھی کیا، اور ان ہی سے مشورے ہونے لگے کہ حج جیسی اہم عبادت میں مشغول ہونے سے پہلے کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ سلامتی کی قرآنی ضمانت مدینہ منورہ پہنچ کر حاصل کر لی جائے۔ ایک سے آگے بڑھ کر بات دو تک اور دو سے تین تک پہنچی، ہمارا قافلہ اکیس ۲۱ آدمیوں کا تھا، فقہاء کا مسئلہ بھی بتا دیا گیا کہ فرض حج میں ان کا فتویٰ یہی ہے کہ حج کے بعد زیارت کے لئے مدینہ منورہ جانا زیادہ مناسب ہے، البتہ نفلی حج میں اختیار ہے حج و زیارت میں سے جسے چاہے پہلے ادا کرے۔" فقہ اور مناسک کی عام

کتابوں میں یہی مسئلہ پایا جاتا ہے، بعض فقیہ الطبع بزرگوں پر فقیر بے نوا کا مشورہ کچھ گراں بھی گذرا، "صوفیت کی رگ پھڑک اٹھی ہے"! مجھ غریب ملّا پر یہ طنز بھی کیا گیا۔ مگر رفتہ رفتہ ملائیت پر صوفیت غالب آئی، اور اکیس آدمیوں کے اس قافلے نے یہی طے کیا کہ بجائے اس مقام کے جہاں فرنگی کپتان کی راہنمائی میں احرام باندھا جائے گا حج کا احرام ذوالحلیفہ میں اسی جگہ انشاءاللہ باندھا جائے گا، جہاں نسل انسانی کے سب سے بڑے حاج صلی اللہ علیہ وسلم نے حج وغیرہ کا احرام باندھا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ "الحج" جو ایک مستقل مطلوبہ و مفروضہ عبادت ہے اس کے ساتھ "زیارت" کے مسئلہ کا تذکرہ محض اس لئے کتابوں میں کر دیا جاتا ہے کہ مکہ معظمہ پہنچنے والے کے لئے مدینہ منورہ تک رسائی نسبتاً آسان ہو جاتی ہے، ورنہ سچی بات یہ ہے کہ بجائے "مدینہ منورہ" کے اللہ کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا روضہ طیبہ اگر مکہ سے ہزاروں میل دور کسی علاقے میں ہوتا تو الحج کے ساتھ "الزیارت" کے ذکر کا خیال بھی کسی کو نہ ہوتا، کیونکہ ایک کا دوسرے سے کوئی تعلق نہیں ہے، ایسا تعلق جو مثلاً وضو کا نماز سے ہے، یا نماز کی مسنونہ دعاؤں کو نماز سے ہے "حج" اپنی ایک مستقل عبادتی حقیقت رکھتا ہے اور آستانہ نبوت کبریٰ پر کسی مرے ٹوٹے گرے پڑے امتی کی حاضری اس کی نوعیت ہی دوسری ہے۔

مگر کتابوں میں "حج و زیارت" کے تذکرہ کا اتفاقی اجتماع، فتنوں کا سبب بن گیا۔ آج شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی طرف جو اس قسم کی باتیں منسوب کی جاتی ہیں، بڑے بڑے لوگوں نے نقل کیا ہے کہ شیخ الاسلام کہتے تھے کہ:۔

انہ[1] لیس من القرب بل بضد ذالك (رسول اللہ کے روضہ کی زیارت ثواب کے کاموں میں نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس ہے (یعنی زیارت کے لئے مدینہ جانا ثواب نہیں گناہ ہے)۔ صنہ زرقانی علی المواھب

---

[1] اس باب میں کافی ذخیرہ مناظراتی کتابوں میں جمع ہو گیا ہے۔ شیخ الاسلام کے مقابلہ میں سب سے زیادہ نمایاں شخصیت علامہ تقی الدین سبکی کی ہے "شفاء السقام" اس سلسلے میں انکی مشہور کتاب ہے، "الصارم المنکی" کے نام سے شیخ الاسلام کے شاگرد ابن عبد الهادی نے جواب بھی دیا ہے اسی کتاب میں ابن عبد الهادی نے لکھا ہے کہ زیارت قبور کو ابن تیمیہ نے اپنی کسی کتاب میں نہ حرام ٹھہرایا ہے اور نہ منع کیا ہے، بلکہ "استحبها وحض علیها" (یعنی اس کو مستحب قرار دیا ہے اور مسلمانوں کو اس پر آمادہ کیا ہے) انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ "مصنفاته ومناسکه طافحة بذکر استحباب زیارة قبر النبی صلی اللہ علیہ وسلم" (یعنی ابن کی کتابیں اور مناسک پر جوان کی کتاب ہے ہر ایک اس مسئلہ کے ذکر سے معمور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کی زیارت بڑا اچھا کام اور محبوب فعل ہے) زرقانی صنہ ابن تیمیہ کے ایک رشید تلمیذ کی اس شہادت کے بعد اور کس چیز کی ضرورت باقی رہتی ہے؟ ۱۲

یا اس کے برعکس بعض مدہوشوں سے سننے میں آیا کہ ہمارے حج کا قبلہ وکعبہ مکہ میں نہیں مدینہ میں ہے، اور کسی غالی گمراہ شاعر نے کہا ہے ؎

نجف مرا مدینہ ہے، مدینہ ہے میرا کعبہ
میں بندہ اور کا ہوں امت شاہ ولایت ہوں

یہ سارے قصے محض اس سے پیدا ہوئے کہ زیارت کا ربط حج کے ساتھ جوڑ دیا گیا، حالانکہ یہ ایسی بات ہے کہ رمضان کے مہینے میں عموماً زکوٰۃ دینے کے لوگ عادی ہیں، تو محض اسی بنیاد پر سوال اٹھا دیا جائے کہ روزہ رکھ کر زکوٰۃ ادا کرنا بہتر ہے۔ یا زکوٰۃ ادا کر کے روزہ رکھنے میں زیادہ خوبی ہے۔

بہر حال فقہائے نے جو کچھ لکھا تھا، وہ بھی سنا دیا گیا اور ساتھ ہی دل میں جو خیال تھا کب تک دبتا، اسے ظاہر ہی کرنا پڑا، ہمارے رفقاء کی مہربانی تھی کہ ترکِ رفاقت پر آمادہ نہ ہوئے خصوصاً ہوش وحواس رکھتے ہوئے جن بزرگوں نے ایک دیوانے کے مجنونانہ مشورہ کے ساتھ ہم نوائی کی دل ان کے اس کرم کا اب بھی ممنون ہے۔

بہر حال عجیب تماشا تھا۔ فرنگی کپتان نے گھنٹی بجائی کہ نا دیدہ یلملم[1] کے سامنے

---

[1] یلملم یمن والوں کی قدیم تاریخی میقات تھی، اب اس نام کی کوئی پہاڑی یمن والوں کے راستہ میں نہیں پڑتی، لیکن قدیم جغرافیہ کی مدد سے اس پہاڑ کو لوگوں نے متعین کیا ہے۔ یہ عجیب بات ہے

(باقی اگلے صفحہ پر)

ہمارا جہاز آگیا اور لوگ احرام باندھنے میں معروف ہوگئے، صرف چند دیوانے اور ان کے ساتھ کچھ ہوش والے بھی تھے جو احرام باندھنے والوں کو حسرت کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے۔ دیکھیے ہماری قسمت میں کیا لکھا ہے! بیچ میں ایک اعتدالی راہ بھی پیش ہوئی کہ عمرہ کی نیت سے مکہ معظمہ حاضر ہوکر زیارت کے لیے مدینہ چلے جائیں اور حج کے موسم میں مکہ معظمہ پھر واپس ہوجائیں، مگر فقہانے لکھا تھا کہ "اشہر حج میں مکہ پہنچنے کے بعد حج کرنے سے پہلے مدینہ نہ جانا چاہیئے"

پورا جہاز احرام کے لباس میں تھا، بجز ان چند حواس باختوں کے جو ساحل جدہ پر عام رواجی غیر احرامی لباس میں اترے تھے۔ ابھی ایک مہینہ سے زیادہ مدت موسم حج کی آمد میں باقی ہے، اس مدت کو گذارنے کے لیے (۲۱) آدمیوں کا یہ قافلہ جدہ سے براہ موٹر سیدھے مدینہ منورہ روانہ ہوگیا، ایک ہی لاری میں

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) کہ اس حساب سے اس پہاڑی محاذات میں ہندوستان سے براہ جدہ مکہ جانے والوں کو دو دفعہ گذرنا پڑتا ہے ایک تو وہی سمندر کا مشہور مقام جہاں عام طور پر احرام باندھنے کا دستور ہے اور دوسری دفعہ یہی پہاڑیاں اس وقت محاذات میں آتی ہیں، جب جدہ سے نکل کر بحیرہ نامی قریہ کے پاس سے لوگ گذرتے ہیں، میقات سے پہلے احرام باندھنا چونکہ جائز ہے حتیٰ کہ گھر ہی سے احرام باندھ کر کوئی چلے تو جرم نہیں اس لئے مروجہ مقام پر احرام باندھنے میں کوئی مضائقہ تو نہیں ہے مگر اس مقام سے گذر کر اگر کوئی بحیرہ کی محاذات میں پہنچ کر احرام باندھے یا جدہ اتر کر باندھے تو اس پر اعتراض کرنے کی بظاہر کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کاش! اہل علم اس مسئلہ کی یکسوئی فرما دیتے۔ ۱۲

سب کو جگہ مل گئی۔

لاری کس حال میں چلی بس عجیب حال تھا وہ منزل جو اونٹوں پر تیرہ چودہ دنوں میں پوری ہوتی تھی شاید ڈیڑھ دو دن میں پوری ہوگئی۔ راستہ میں شدت تمازت کی وجہ سے اور رات کی تاریکی کی وجہ سے غالباً دو تین جگہ اترنا پڑا، ایک منزل کا بیر حصانی (حسانی) نام یاد رہ گیا ہے، اس لئے یاد رہ گیا ہے کہ رات کو اس منزل کے خس پوش جھونپڑے میں قیام تھا، ایک مقامی عرب میرے قریب آیا، عربی میں خطاب کا جواب پاکر مانوس ہوا، باتیں کرنے لگا، پوچھا گیا کہ سعودی حکومت کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے اس نے جو کچھ کہا تھا حاصل اس کا شاید یہی تھا کہ:۔

"سعودی حکومت کے آنے سے پہلے ہم حج کے راستے میں رہنے والے بدوؤں کا کام صرف رہ زنی، چوری، مردم کشی قتل و غارت کے سوا اور کچھ نہ تھا، سعودی حکومت نے بحمد اللہ ہماری مردہ انسانیت کو زندہ کر دیا، اب ہم آدمی ہیں، ہمیں مختلف جائز معاشی پیشوں میں اب مشغول کر دیا گیا ہے۔ اس حکومت کے ہم بہت ممنون ہیں"

کچھ ایسا یاد پڑتا ہے کہ میں نے اس اعرابی سے شاید یہ بھی پوچھا کہ صدیوں کی پڑی ہوئی بری عادتوں کے ازالہ میں آخر سعودی حکومت کامیاب کیسے ہوئی؟ جواب میں شاید اس نے "اِثخان فی الارض" کی تدبیر کا حوالہ دیا جہاں

جہاں ان لٹیروں کے اڈے تھے۔ بے دردی کے ساتھ وہاں خونریزی کی گئی۔ چور دھرم کی کہانی نہیں سنتے ان کے لئے تو بجائے دھرم کے دھریہ ہی کی ضرورت ہوتی ہے، حکومتوں کا بھاشنی طریقہ نہ پہلے کامیاب ہوا ہے، اور نہ آئندہ ہوسکتا ہے۔

یہ میری آنکھوں دیکھی باتیں ہیں کہ ترکی شریفی عہد میں حج کرنے والے پیش رووں سے حرامیوں (عربی رہزنوں) کے جو مہیب قصے ہم نے سنے تھے، ان کا کہیں نام ونشان بھی اس پورے راستے میں نظر نہ آیا، تن تنہا سر پر چھتری لگائے پیدل سفر حج کرنے والوں پر لاری سے نظر پڑی، وہ بڑے اطمینان سے جا رہے تھے، کسی منزل میں ہمارے ساتھیوں کی کوئی چیز غائب نہ ہوئی، دوسروں سے تو ایسے قصے بھی سننے میں آئے کہ چھوٹا ہوا یا گمشدہ مال ان تک پہنچا دیا گیا، حکومت کے کارندے اس معاملے میں بڑی ہوشیاری اور ذمہ داری سے کام کر رہے تھے، جس منزل میں بھی اترنے اور کچھ دیر قیام کرنے کا موقعہ ملا، وہاں نشست و برخاست اٹھنے بیٹھنے لیٹنے پسٹنے کا کافی انتظام تھا، اس وادیٔ غیر ذی زرع کے ان خس پوش جھونپڑوں کے اندر یہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ تنوری روٹیوں کی تھاک اپنے سامنے جمائے ہوئے فول[1] کی ترکاری یا گوشت کے ساتھ کھانے والے کھا رہے ہیں، جن میں ادنیٰ

---

[1] سیم کے بیجوں کے مانند ایک قسم کو فول کہتے ہیں عرب میں غالباً مصر سے درآمد ہوتے ہیں، بکثرت ان بیجوں کو ترکاری کی شکل میں استعمال کرنے کا رواج وہاں ہے۔ ۱۲

درجے کے حمال (شتربان) اور بار برداری کے کام کرنے والے مزدور بھی تھے
"الرزاق ذوالقوۃ المتین" کی رزاقیت کی تجلیاں ان اجاڑ سنگستانوں
میں قدم قدم پر چمک رہی تھیں اور بصیرت کی آنکھوں کو خیرہ کرتی تھیں،
واقعہ یہ ہے کہ ہند کے مرغزاروں میں بھی "رزاقیت" کی یہ شان اتنی نمایاں نہ
تھی، جتنی عرب کی ان چٹیل وادیوں میں دیکھی جارہی تھی، وہی طبقہ جو ہندستان
میں ستو یا بھنے چنوں پر کل وغیرہ کے سوا کچھ نہیں پاتا عرب میں اسی طبقہ سے
تعلق رکھنے والوں کو روٹیاں بھی بافراط میسر آرہی تھیں، اور قول کی ترکاری میں
بلامبالغہ یہ عرض کررہا ہوں کہ ایک انچ سے کم گھی اس پر تیرتا ہوا نہیں
دکھائی دیتا تھا۔

پانی بھی ہر جگہ ملتا جاتا تھا۔ مگر گوارائی کی کیفیت دور تک عرب کے
پانی میں محسوس نہ ہوئی شربہ کے نام سے صراحیاں پیش ہوتی تھیں۔ دام ادا کرکے
لوگ پیتے تھے وضو کرتے تھے۔ کہیں کہیں "حب حب" کے شور سے منزل
گونج اٹھتی، یہ تربوز کا جدید عربی نام تھا۔

مرا دلاور (ڈرائیور) یا سواگ (سواق) ایک مصری مسلمان تھا۔ عربی
مکالمہ کی وجہ سے مجھے یا استاذ کہتا، اور مسافروں سے کچھ کہنا سننا ہوتا، تو
میری طرف رجوع کرتا۔

باوجود بے ہوشی کے اپنے ہوش کا ایک قصہ بھی سنادوں، لاری ایک ہی

تھی، ۱۲ آدمیوں کے سوا بھی کچھ دوسرے لوگ اس میں گھسائے گئے تھے، چند آدمی یمن ہٹ کے تھے اور ایک صاحب پنجاب کے، جگہ میں قدرۃً غیر معمولی تنگی پیدا ہوئی، فقیر نے عرض کیا کہ آپ لوگ اپنی اپنی نشست پر بیٹھ جایئے. میری پرواہ نہ کیجئے۔ میں اپنی جگہ نکال لوں گا۔ اطراف کی نشست گاہوں پر سب بیٹھ گئے۔ بیچ میں جو خلا باقی تھا اس میں بسترے وغیرہ ٹھونس دیئے گئے دیوانے نے عرض کیا کہ بس اسی خلا میں اپنے لئے ملا پیدا کرتا ہوں۔ چند بستروں کی وجہ سے کافی گداز گدے کی کیفیت اس میں پیدا ہو گئی تھی، بندہ اسی پر بیٹھ گیا۔ جس کے لئے لاری میں کوئی مستقل جگہ نہ تھی۔ اب ایک ایسی جگہ پر قابض تھا کہ گویا بڑے موٹے گدے پر بیٹھا ہوا ہے، جی چاہتا تو اسی پر لیٹ بھی جاتا۔ بعضوں نے چاہا کہ مستقل جگہ جس پر وہ قابض ہو چکے تھے اس سے اس غیر مستقل جگہ کو بدلیں۔ لیکن "سبقك بها عكاشة" اور "منى مناخ من سبق" کے اصول پر انکار کر دیا گیا۔

راستہ میں ایک دو جگہ۔ خفیف سی ناگواریوں کے واقعات بھی شاید

لے یمن کے ان مسلمانوں کی شکل وصورت بہت کچھ ان ہندی مسلمانوں سے ملتی جلتی تھی، جو اس علاقہ میں پارچہ سازی کا کام کرتے ہیں خیال گذرا کہ عربی نژاد ہونے کا دعویٰ ہندی پارچہ بافوں کی طرف سے جو کیا جاتا ہے غالباً بے بنیاد دعویٰ نہیں ہے۔

پیش آئے جو یاد نہیں رہے۔ اور نہ ان کو یاد رکھنا چاہیئے۔ شاید بیر حسانی جو غالباً میدان بدر ہی کے قریب کوئی منزل ہے، وہاں تک تو سنگستان اور کبھی کبھی ریگستان سے گذرتے رہے۔

مگر یہاں سے گذرنے کے بعد اب نہیں کہہ سکتا کہ کتنی دیر بعد اچانک گردو نواح میں تدریجی طور پر تبدیلی محسوس ہوئی پہلے ایسے میدانی علاقے مل رہے تھے جن کی چاروں طرف خشک چٹیل پہاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں، مگر عجب پہاڑیاں ہیں۔ عقیدت کی آنکھوں کے سوا بھی ان سے معلوم ہوتا تھا کہ نور ابل رہا ہے پہاڑوں کے درمیان رہنے کا عادی زمانہ سے ہوں۔ خصوصاً دکن کے قیام کے بعد تو ہم بھی ایک قسم کے پہاڑی آدمی بن کے رہ گئے تھے۔ راجپوتانے میں بھی آٹھ دس سال پہاڑوں ہی میں گذرے تھے لیکن وادی غیر ذی زرع کی ان چٹیل پہاڑیوں کا رنگ ہی نرالا تھا، پھر اسی کے ساتھ حدیثوں کے وہ سارے مقامات اور ان کے ارتسامات دماغ میں ابھرتے چلے جاتے تھے جن کا عرب کے اسی کوہستانی علاقے سے عموماً تعلق ہے محسوس ہوتا کہ شاید اسی پہاڑی پر گورخر کی وہ ٹولیاں حضرت ابو قتادہ انصاری کو نظر آئی ہوں گی، جن کا پیچھا کر کے نیزے سے ایک گورخر کا شکار کیا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ایک ران چھپالی تھی، یہ اور اسی قسم کے بیسیوں واقعات تحت الشعور سے نکل نکل کر شعور کی سطح پر مسلسل تیرتے

ابھرتے اور ڈوبتے۔

ہاں! تو اچانک رت بدل گئی، بجائے دور کے پہاڑ کچھ زیادہ قریب نظر آنے لگے اور چٹیل میدانوں کی جگہ اب ایسی وادیاں سامنے آرہی تھیں جن میں بڑے بڑے تناور درختوں کا پھر بھی پتہ نہ تھا۔ لیکن باریک باریک پتیوں والے مغیلانی قسم کے چھوٹے چھوٹے درخت اور ادھر اُدھر گھاس بھی نظر آنے لگی، جن میں بھیڑوں اور مینڈھوں، بکریوں کے گلے چرتے دکھائی دیتے تھے۔ چرانے والی عموماً ان کی عورتیں تھیں، جن کا لباس سیاہ تھا، اور سر سے پاؤں تک کپڑوں میں ہر ایک کا جسم مکمل طور پر ڈھکا ہوا تھا۔ بعض مقامات پر بعض معمر اور ادھیڑ عمر کی عورتیں انڈوں کے ساتھ بھی لاری کے سامنے بیچنے کے لیے کھڑی ہو جاتیں، ان کا لباس بھی مکمل تھا، عرب کی غربت و افلاس کے عام چرچوں کے مقابلہ میں صحرائی اور بیابانی باشندوں کی غذائی اور لباسی نوعیت کے متعلق میرے یہ مشاہدے باعث حیرت بنے ہوئے تھے، اگرچہ بعض آبادیوں اور منزلوں میں جہاں لاری کسی وجہ سے ٹھہر جاتی یہ تماشا بھی دیکھنا پڑتا کہ چھوٹے چھوٹے بچے اور بچیاں لاری کو گھیر کر "یا الحاج بخشیش ھات ما فی الکیس" (یعنی حاجی بخشش عطا کرو، تمہاری جیب میں جو کچھ ہے اسے حوالہ کر دو) ایک خاص نغمہ کے ساتھ گاتے اور لاری کا پیچھا بھی کرتے، لیکن بجائے غربت کے زیادہ تر بچوں کے اس عام

طریقہ کار میں مجھے عادت کی تاثیری کیفیت محسوس ہوتی تھی۔

لاری اسی حال میں بڑھی چلی جارہی تھی، پہاڑیاں قریب سے قریب تر چلی آتی تھیں، اب قرب کا نتیجہ تھا یا واقعہ بھی یہی تھا کہ بلندیاں بھی ان پہاڑیوں کی ترقی پذیر تھیں، تاآنکہ اونچے اونچے بلند پہاڑوں کے دروں میں لاری داخل ہوئی، کہیں کہیں چٹانوں پر تیتر جیسے جانور بھی نظر آتے۔ خیال گذرا کہ "قطا" شاید یہی ہے جس کا ذکر کتابوں میں کیا گیا ہے، کہیں کہیں جنگلی کبوتر کے جوڑے بھی دکھائی دیئے۔

بیس سال سے زیادہ مدت سفر پر گذر چکی ہے اور مولانا عبدالماجد کی "سفرنامہ حجاز" نامی کتاب بھی سامنے نہیں ہے اس لئے مقامات کے نام اور ان کی ترتیب مکانی بھی صحیح طور پر یاد نہیں ہے۔ اتنا خیال آتا ہے کہ مسیجد نامی منزل جہاں سعودی شرطہ کا مستقر (پولیس اسٹیشن) بھی تھا اس منزل تک پہنچنے کے بعد اپنے آپ کو ہم لوگوں نے سبزہ زاروں کے درمیان پایا۔ پہاڑ بھی کلیۃً چٹیل اور نباتاتی وجود سے خالی نہ تھے، مگر پانی کی کیفیت میں غالباً مسیجد تک کسی قسم کی تبدیلی محسوس نہ ہوئی کہ اچانک وہاں پہلی دفعہ ایسا پانی پینے کے لئے ملا کہ آج تک اس کی لذت اور خنکی کا خیال مسرت بخش ہے وہاں کچھ کھجوریں بھی ملے، جو کافی لذیذ تھے۔ حالانکہ بدقسمتی سے تازہ کھجوروں کا یہ موسم نہ تھا، اس موسم کی آرزو ہی دل میں رہ گئی۔

مگر یہ سب کچھ باہر میں ہو رہا تھا، اندر کس حال میں تھا، الفاظ اس کے اظہار سے قاصر ہیں۔ رابغ جس کا قدیم نام جحفہ تھا اس منزل کی وہ بات دماغ سے نہیں نکلتی، تھوڑی دیر کے لئے یہاں بھی لاری ٹھہرائی گئی تھی، لوگ اتر کر ادھر ادھر ٹہلنے لگے۔ اس فقیر نے ان جھونپڑوں کے پیچھے اس وقت ایک کافی معمر سفید ریش بزرگ کو اس حال میں پایا کہ دونوں ہاتھوں کو پھیلا کر وجد کے عالم میں کچھ اس قسم کے احساس کا اظہار فرما رہے ہیں کہ ؎

کہاں میں اور کہاں رابغ کی منزل
کہاں سے کس جگہ لایا گیا ہوں

وہ استغراق کے حال میں جھوم رہے تھے دل سے باتیں کر رہے تھے میری آہٹ پا کر سمٹ گئےؑ، ان کا یہ حال تو دیکھا گیا ورنہ سچ پوچھئے تو قافلہ کے اکثر و بیشتر رفقاء کے باطن کا حال یہی تھا۔ دنیا کی تمام نعمتوں میں جن دو نعمتوں کو بعض دیدہ وروں نے سب سے بڑی نعمتیں قرار دیا ہے[1]، آج ہی دو نعمتوں

ؑ یہ بزرگ مولانا عبدالباری صاحب کے والد صاحب قبلہ تھے جواب دوسرے عالم میں ہیں۔

[1] شیخ محدث دہلوی نے اخبار الاخیار میں سید صدرالدین بخاری کا قول نقل کیا ہے "دو نعمت در عالم بالفعل موجود ست کہ فوق جمیع نعمہاست ولیکن مردم قدر آں نعمت نمی شناسند و بداں پے نمی برند۔۔۔۔ یکے آں کہ وجود مبارک محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم بصفت حیات در مدینہ موجود ست۔" یہ پہلی نعمت ہوئی اور دوسری نعمت یہ ہے کہ قرآن مجید کہ کلام پروردگار ست و وے سبحانہٗ تعالیٰ بے واسطہ بداں متکلم" ص ۲۱۵ اخبار الاخیار

میں سے ایک نعمت یعنی" وجود مبارک محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم بصفت حیات در مدینہ موجود ست"

ان کے آغوش میں آرہی تھی، جنہوں نے نہیں مانا ہے ان جھٹلانے والوں سے تو بحث ہی نہیں، مگر جو مان چکے ہیں وہ بہر حال یہی یقین رکھتے ہیں اور یہی یقین ان میں پیدا کیا گیا ہے کہ ذائقۃ الموت کی منزل سے گذرنے کے باوجود الموت کا اثر صرف اسی قدر ہے کہ اکل و شرب جیسی جسمانی ضرورتوں سے بے نیاز ہو کر "الرفیق الاعلیٰ" کی زندگی پیغمبر گذار رہے ہیں اور پیغمبر تو خیر پیغمبر ہی ہیں، الموت کا یہ مطلب کہ احساسات سے مرنے والے محروم ہو جاتے ہیں یہ ان لوگوں کا خیال ہے جن کو موت کے چکھنے کا تجربہ نہیں ہوا ہے، تجربے کے بغیر بے جانے اپنے اندر ایک ایسا فیصلہ رکھتے ہیں جس کی بنیاد قطعاً کسی علم پر نہیں بلکہ جہل اور صرف جہل پر قائم ہے، قرآن میں شاید اسی قسم کے غلط غیر استحقاقی فیصلہ کرنے والوں کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ مرنے کے بعد بھی اپنے احساسات کو زندہ پاتے ہوئے وہ آرزو کریں گے کہ:-

يَا لَيْتَنِي كُنْتُ تُرَابًا ؕ[1] (النبأ)	کاش! میں (جیسا کہ سوچا کرتا تھا) خاک ہوتا (یعنی احساسات سے مرنے کے بعد محروم ہو جاتا)

[1] سورۃ النبأ کے آخر میں فرمایا ہے کہ "انا انذرناکم عذاباً قریباً یوم ینظر المرء (باقی اگلے صفحہ پر)

(باقی اگلے صفحہ پر)

بہر حال جو پیغمبر نہیں ہیں جب موت ان کو بھی تراب یا خاک بنا کر نہیں چھوڑ دیتی تو نبوت و رسالت کے عالی مقامات سے جو سرفراز ہیں، ان کے متعلق جو یہ سوچتے ہیں کہ "خاک کے ڈھیر" کے سوا ان کی قبروں میں بھی کچھ نہیں ہوتا، ان کی سمجھ پر خاک پڑ گئی ہے اس کے سوا اور کیا کہا جائے؟ عام مسلمانوں کے قبور پر ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ان کو سلام کریں اور ان سے اس قسم کی باتیں کریں کہ "آپ ہم سے پہلے چلے گئے، ہم بھی آپ کے پیچھے پیچھے آرہے ہیں اللہ آپ کی کمزوریوں سے درگزر فرمائے، وغیرہ وغیرہ" تو کوئی وجہ ہو سکتی ہے کہ جس پیغمبر کو قرآن میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ "میری آیتوں کے ماننے والے تمہارے پاس جب آئیں، تو ان کو "سلام علیکم" کہو،

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) ما قدمت یداہ" (ہم تمہیں نزدیک والے عذاب سے ڈرا رہے ہیں جس دن دیکھے گا آدمی ان چیزوں کو جنہیں اس کے دونوں ہاتھوں نے آگے روانہ کیا تھا) الغرض بجائے عذاب بعید کے عذاب قریب کی جو دھمکی دی گئی ہے اور اس کی خصوصیت یہ بتائی گئی ہے کہ اپنے کئے ہوئے اعمال کا مشاہدہ کرایا جائے گا۔ میرے خیال میں یہ عذاب قریب عذاب قبر ہے۔ الکافر (نہ ماننے والا) اس وقت کہے گا کہ کاش میں خاک ہوتا (یعنی احساسات اگر ختم ہو جاتے تو جن نظاروں سے وہ دوچار ہو رہا ہے انہیں نہ دیکھتا) عذاب قبر کے متعلق یہ نص صریح ہے سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ اور اسی قسم کی قرآنی آیتوں کے بعد بعض لوگوں نے یہ خیال کیسے قائم کر لیا ہے کہ مرنے کے بعد مرنے والا مٹی ہو جاتا ہے۔ والقصۃ بطولہا ۱۲

اور آگاہ کر دو کہ نادانی کی وجہ سے برائی کا ارتکاب جس نے کیا ہے لیکن پھر اس کے بعد پلٹ گیا اور سنور گیا، تو حق تعالےٰ غفور، رحیم ہیں۔" قرآن کے اس نص قطعی کی یافت کے بعد کوئی وجہ ہو سکتی ہے کہ ہم سلام کی اس دعار کو حاصل کرنے کے لئے وہاں حاضر نہ ہوں جہاں حاضر ہونے والوں کو السلام علیکم کہنے کے لئے پیغمبر اپنے خدا کی طرف سے مامور ہوا؟ کچھ بھی ہو، نہ ماننے والے جو چاہیں کہیں جو کچھ جی میں آئے خیالات پکائیں، مگر ہم تو یہی جانتے ہیں کہ عہد نبوت ہی میں وفات سے پہلے قرآن میں اعلان کر دیا گیا تھا کہ پیغمبر کی موت کو عام لوگوں کی موت پر قیاس نہ کرنا چاہیئے حکم دے دیا گیا تھا کہ ان کے ازواج سے وفات کے بعد نکاح کا ارادہ کوئی نہ کرے، یہ بھی بتلا دیا گیا تھا کہ پیغمبر کے متروکہ میں وراثت جاری نہ ہوگی، وفات کے بعد بھی دیکھا جاتا تھا کہ مسجد نبوی کے پڑوس والے دیوار میں کھونٹی ٹھوکتے تو صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا کہلا بھیجتیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف نہ دو، مسجد نبوی میں زور سے گفتگو کرنے والوں کو ٹوکا جاتا، اور یہ کہتے ہوئے ٹوکا جاتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد میں ایسا کرتے ہو۔

لہ انہ حی فی قبرہ "(یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے روضہ پاک میں زندہ ہیں) وانہ لایبلی جسدہ (اور آپ کا جسد مبارک تغیر سے محفوظ ہے) یہ مسلمانوں کے مسلمہ عقائد ہیں جو قرآن وحدیث اور عمل صحابہ پر مبنی ہیں) تفصیل کے لئے بڑی کتابوں کا مطالعہ کیا جائے اور سچ تو یہ ہے

(باقی اگلے صفحہ پر)

خیر میں مدرسہ کے کن جھگڑوں میں پھنس گیا جن میں پھنس جانے کے بعد بسا اوقات بدیہی سے بدیہی مسائل بھی نظری بن جاتے ہیں۔

قافلہ بیر درویش کے بعد قریب قریب اپنے اوسان کھو چکا تھا، فاصلہ ختم ہو رہا تھا، زندگی کی آرزو، سب سے بڑی آرزو ایمان والوں کی پوری ہو رہی تھی، یا قریب تھا کہ پوری ہو اپنے آپ کو معلوم ہوتا تھا کہ ہر ایک

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) کہ علاوہ روایتوں کے مسلسل مشاہدات سے بھی اس کی تصدیق ہمیشہ ہوتی رہی ہے۔ سعید بن المسیب ہی کا واقعہ کہ ایام حرّہ میں جب چند دنوں کے لئے مسجد نبوی میں کوئی نماز پڑھنے والا باقی نہ رہا تھا، صرف سعید مسجد کے کسی گوشے میں چھپ گئے تھے۔ دارمی وغیرہ جیسی معتبر کتابوں میں سعید کا یہ بیان منقول ہے کہ تین دن تک وہ پانچوں وقتوں کی نماز اس ہمہمہ (گونج کی سی آواز) کے سہارے سے ادا کرتے رہے جو روضہ پاک سے آتی تھی، دوسری کتابوں مثلاً ابونعیم وغیرہ کی روایت ہے کہ روضہ پاک سے اذان کی آواز ان کے کان میں آتی تھی، ابن سعد نے بھی طبقات میں اذان والی روایت نقل کی ہے، اسی سلسلے میں نورالدین زنگی غازی کا مشہور تاریخی واقعہ بھی ہے کہ یورپ کے کسی خبیث النفس حکمران نے اپنے دو نمائندوں کو مدینہ منورہ اس ناپاک غرض کی تکمیل کے لئے بھیجا تھا کہ جسد مبارک کو کسی طرح نکال کر لے آئیں ایک کرہ لے کر اندر سرنگ لگائے ہوئے وہ کام کر رہے تھے کہ اسی عرصہ میں دمشق میں نورالدین زنگی رحمۃ اللہ علیہ کو رویا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ایما ہوا وہ مدینہ پہنچے اور مجرموں کو پکڑ لیا انہوں نے اقرار کر لیا۔ مختلف کتابوں میں یہ واقعہ آپ کو مل سکتا ہے اور اس سلسلہ میں تجربات کی کیا کمی ہے؟!

گھومتا چلا جا رہا ہے اچانک اسی حال میں "مدینۃ النبی" (صلی اللہ علیہ وسلم) کی آواز سواق (ڈرائیور) کی زبان سے نکلی، کلیجے نکل پڑے، جانیں قالب کو معلوم ہو رہا تھا کہ چھوڑ دیں گی، بیس سال پہلے کان میں یہ آواز آئی تھی، لیکن اس کی گونج آج بھی تر و تازہ ہے۔

ہم میں ہر ایک دوسرے کو شاید بھول گیا "مدینۃ النبی" (نبی کا شہر) اس کے سوا نہ اندر ہی میں کچھ باقی تھا اور نہ باہر میں، لاری تیزی کے ساتھ گزرتی جا رہی تھی یہ باہر میں ہو رہا تھا اور اندر میں جذبات کا طوفان تھا، جو ابل رہا تھا۔ اوروں کا حال معلوم نہیں لیکن اپنے اس احساس کو کیسے چھپاؤں، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ بلال آ رہے ہیں، یہ ابوذر جا رہے ہیں، یہ فاروق اعظم ہیں، ادہر حضرت صدیق ہیں (رضی اللہ تعالیٰ عنہم)۔

میں جانتا ہوں کہ یہ دماغی اختلال ہی کا نتیجہ ہوگا مگر مبارک تھا وہ دماغی اختلال جس میں مبتلا ہونے والے کے کان میں گزرتی ہوئی لاری میں آواز آئی "السلام علیکم مولوی صاحب!" حضرت بلال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مہمانوں کے میزبان ایسا معلوم ہوا کہ کہتے ہوئے گزر گئے، رضی اللہ تعالیٰ عنہ جنون کی ایسی باتوں کا کہاں تک تذکرہ کیا جائے۔

واقعہ یہ ہے کہ باب العنبریہ کب آیا، لاری سے لوگ کس وقت اترے کیسے اترے، گھوڑے کی گاڑی، عرآبہ میں کب سوار ہوئے، ہوئے تو یہ

سارے واقعات ہم چل بھی رہے تھے پھر بھی رہے تھے ، لیکن جسم چلتا تھا ، ٹانگیں پھر رہی تھیں مگر ان کا چلانے والا حاسہ غائب تھا۔

شاید سیدنا حضرت مولانا حسین احمد المدنی مدظلہ العالی کے برادر محترم حضرت مولانا سید احمد رحمۃ اللہ علیہ مہاجر مدینہ " باب عنبریہ " (جو مدینہ منورہ کا مرحوم حجاز ریلوے کا اسٹیشن تھا) وہاں تک تشریف لائے تھے ، ان کو اطلاع دے دی گئی تھی ، اور ایک قدیم مدنی دوست لطفی صاحب مرحوم بھی اپنے خوبصورت شامی چہرے کے ساتھ دیوانوں کو لینے کے لئے اس مقام تک آئے تھے ۔

" ولے بر بندش " کی شکل میں النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے " مدینہ میں پہنچا دیئے گئے ، لکھا پڑھا سب غائب ہو چکا تھا ، جس نے جو کچھ کہا وہی کرتے چلے جاتے تھے ، غسل کا حکم دیا گیا ، کپڑے بدلوائے گئے اور اب ایک سیاہ کار ، سیاہ بخت ، سیاہ عمل مطلق تاریکی صرف سیاہی کو گھسیٹتے ہوئے اس دربار کی طرف لوگ لے جا رہے تھے ، جس دربار تک رسائی کا خیال بھی اس سراسر ظلم و گندگی کے لئے ناقابل برداشت تھا آج وہی گھسٹا جا رہا تھا ، اور لایا جا رہا تھا ، بیعت کے بعد عہد کا توڑنے والا مجرم اپنے آقا کے آستانہ کی طرف دھکیلا جا رہا تھا ، بس اتنا ہوش تھا کہ ہوش باقی نہیں رہا ہے ، معلم یا مزور کے نام سے کوئی صاحب تھے ۔ ہاتھ پکڑے ہوئے تھے ۔ وہ کچھ کہتے جاتے تھے آنسوؤں کی موسلا دھار بارش سے بند آنکھوں نے اس کا موقعہ باقی نہ رکھا تھا کہ کہاں ہوں ،

آگے کیا ہے کی خبر ہو۔ کان میں معلم کے فقرے اور وہ بھی نہیں معلوم پورے آتے بھی تھے یا نہیں مگر زبان ان ہی فقروں کو دہرا رہی تھی، معلم کہتے تھے کہ "سلام پڑھو، کس کو سلام کروں، آنکھوں میں اس کی قوت بھی باقی رہی ہے جو کسی طرف اٹھے، چیخ تھی پکار تھی، گریہ تھا، بکا رتھا، بے ہوشی تھی، بدحواسی تھی، کیا عہد کیا تھا عہد کرنے والے نے مگر کیا کیا سے

چہ گونہ سر زخجالت برا درم بردوست
کہ خدمتت بسزا برنیا مداز دستم

حجاب، شرم، ندامت "اے اللہ کے رسول اے عالمین کی رحمت" ڈھانک لے اس کی سیاہیوں کو جس میں سیاہی اور تاریکی کے سوا کچھ نہیں ہے۔

ہوں سیاہ کار مرے عیب کھلے جاتے ہیں کملی والے مجھے کملی میں چھپالے آجا

نماز کا وقت بھی شاید قریب تھا۔ سب جہاں کھڑے ہوتے وہیں ہوش باختہ بھی کھڑا تھا۔ یہ کیا ہوا میں کہاں لایا گیا، کلیجہ پھٹ جائے گا، روح نکل جائے گی، ہم کس حال میں آتے۔ کیا ساتھ لائے۔ صرف پاپ، صرف گندگی، صرف آلودگی، سب باہر ہوئے۔ ان کے ساتھ باہر ہوگئے۔ آتے بھی جاتے تھے، لیکن چوبیس گھنٹوں تک کچھ پتہ نہ چلا کہ کہاں آ رہے ہیں کہاں جا رہے ہیں۔ نمازیں بھی ہوتی تھیں، کھانا بھی کھایا جاتا تھا، شاید ملنے والوں سے کچھ باتیں بھی ہوتی تھیں، لیکن چوبیس گھنٹوں تک،

کرنے والے کو خود اپنے ان کاموں کا صحیح احساس نہ تھا۔ سب کرتے تھے وہ بھی کرتا تھا۔

مگر جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، سکینت کا نزول قلب پر شروع ہوا، خود تو کیا پیدا ہوتی، مگر ہمت پیدا کرائی گئی، اور اب آنکھ کھلی، ہم کھجور کے تنوں پر کھڑی ہوئی اس مسجد کو ڈھونڈھ رہے تھے جس کی چھونی کھجور کے پتوں اور شاخوں سے کی گئی تھی، جہاں کے رسول غریبوں کے ملجا، تیمیوں کے ماوی کا دولت خانہ وہ کہاں ہے جس کے چھپر سے کھڑے ہونے والا سر چھوا جاتا تھا، جس کی دیوار کھجور کی چھڑیوں پر مٹی لپیٹ کر بنائی گئی تھی، ابوایوب انصاری کا وہ مکان کہاں ہے جو ہجرت کے بعد پہلی فرودگاہ اس آبادی میں تھی۔ ڈھونڈھتا تھا۔ اس کی گلیوں میں حسن کو حسین کو سید الشہدا، حمزہ کو، امہات المومنین صدیقہ عائشہ، حفصہ، میمونہ، صفیہ اپنی ماؤں کے محل سراؤں کو اور ام حرام بنت ملحان کو ابوہریرہ اور ابن عمر، ابن مسعود کو ابوسعید خدری کو انس بن مالک کو، اور کیا کیا بتاؤں کہ کن کن کو، رضی اللہ تعالےٰ عنہم اور ان کے گھروں کو، مگر نہ وہ مسجد ہی تھی اور نہ وہ مکانات، نہ ان کے رہنے والے معلوم ہوا کہ انصاری صحابیوں کا کوئی خاندان اب مدینہ میں نہیں پایا جاتا، نہ انصاریوں ہی کا کوئی خاندان تھا اور نہ مہاجرین کا۔

زمانہ تیرہ سو سال آگے نکل چکا تھا، عبدالمجید خلیفہ ترک کی بنائی ہوئی ایک شاندار مسجد کا نام اب مسجد نبوی ہے۔ دیکھا کہ قدم قدم پر طلائی حروف میں بہترین

کتبے مسجد کی دیوار پر ثبت ہیں۔ سنا کہ اب تو کچھ بھی نہیں ہے۔ شریف حجاز کی بغاوت کے زمانہ میں جواہرات کا جو ذخیرہ تھا اسے ترک ساتھ لے گئے وہی چیزیں رہ گئی ہیں جنہیں نہیں لے جاسکتے تھے۔ جن میں ان ہی کے عہد کا قائم کیا ہوا ایک فرسودہ ڈائنامو (برقی چرخ) بھی تھا، جس سے تھوڑی بہت روشنی مسجد نبوی کے لئے مہیا ہوتی تھی کسی صاحب دل نے یہ بھی کہا کہ ترکوں کی ان اولوالعزمیوں نے جو مدینہ قدیم کو مدینہ جدید بنانے کے لئے کر رہے تھے ان غریبوں کو یہاں سے نکلوا دیا۔ انہوں نے مسجد نبوی کے اطراف کے مکانوں کو لے کر ارادہ کیا تھا کہ ایک اپ ٹو ڈیٹ گارڈن (عصری باغ) اس کے اردگرد بنا دیا جائے۔ حجاز ریلوے کے کھل جانے کے بعد شام سے مدینہ ایسی چیزیں درآمد ہونے لگیں، جو یہاں سے نکلنے کے تیرہ سو سال بعد یہاں واپس ہوتی تھیں۔

جدید نوعیت کا ایک رسٹوران دار المسترت نامی جس سے وہ سب کچھ ملنے لگا تھا، جو شام کے انگوروں سے تیار ہوتا تھا۔ باب العنبریہ کے قریب حجاز ریلوے اسٹیشن کے سامنے "مدینہ یونیورسٹی" کی داغ بیل بھی پڑ چکی تھی، دیواریں یونیورسٹی کی عمارت کی کچھ اوپر بھی آ چکی تھیں، کہ مدینہ منورہ کے، تین رجفوں (زلزلوں) میں سے ایک رجفہ آیا۔ جنگ عظیم جرمنی کے ملک سے شروع ہوئی۔ اور اثر اس کا حجاز کے اس شہر پہ پڑا۔ جسے ترک ایک یورپین شہر کا قالب عطا کرنا چاہتے تھے۔ ایک لاکھ بیس ہزار کی آبادی اس رجفہ کے بعد اس زمانہ میں

پندرہ بلیں ہزار تک گر کر پہنچ چکی تھی، اور یہ قصہ تو بعد کا ہے ورنہ حرم فروش شیخ حرم کے زمانہ میں تو گنتی یا گنتی کے چند نفوس کے سوا مدینہ منورہ میں کوئی باقی نہ رہا تھا۔ بڑا ہی زہرہ گداز عبرت آموز منظر تھا کہ یونیورسٹی بننے والی عمارت مدینہ والوں کا "حش"[1] بنا ہوا تھا اور چھ سو میل لمبی لائن پر چلنے والی ریل گاڑی کے ڈبے اسی باب العنبریہ کے آس پاس مرے ہوئے بھینسوں کی لاشوں کی طرح پڑے ہوئے تھے! الحمد للہ کہ "سکینت" کے یہ ایام ایک مہینہ سے زیادہ میسر آئے ؎

کام دل حاصل دایام بکام است امروز
چشم بر روئے نگار لب بجام است امروز

اوروں کا حال معلوم نہیں مگر جو دیوانہ تھا وہ اسی نئے مدینہ میں پرانے مدینہ کو تلاش کرتا رہتا تھا۔ یہ نئے مدینہ کے آبادکاروں سے بھی ملتا جلتا تھا وہ بڑے اچھے لوگ تھے عموماً دعوتیں کرتے تھے۔ مگر اپنا دل اس نئی آبادی میں پرانے مدینہ کے پرانے باشندوں کو ڈھونڈھتا تھا۔ اتفاقاً مدینہ کے ایک مورخ بھی مہربان ہو گئے۔ حکمت عارف بے کے کتب خانے کے مہتمم صاحب، جدید مدینہ سے زیادہ ان کی دلچسپیوں کا محور بھی قدیم مدینہ ہی تھا، ان کے طفیل میں سقیفہ بنی ساعدہ، بیر بضاعہ، العوالی بنی نضیر و بنی قریظہ، کی گڑھیوں کے آثار اور اسی قسم کے بیسیوں مقامات کا پتہ چلا۔

حضرت مولانا سید احمد مہاجر رحمۃ اللہ علیہ کا مدرسۃ الشرعیہ اور حضرت کا دولت خانہ

---

[1] عوام کے قضاء حاجت کی جگہ ۱۲

سب سے بڑا ماوی اور ملجا تھا۔ ہر ضرورت وہیں سے پوری ہوتی تھی حضرت والا نے مدینہ منورہ کے غالباً مشرقی سمت میں ایک میدانی زمین کو قابل کاشت بنا کر زراعت کا طریقہ صدیوں کے بعد اس شہر میں مروج کیا تھا۔ مدینہ والے حرث سے قطعاً نا آشنا ہو چکے تھے۔ ان کا سرمایہ معیشت قیصر کے شہر کی وہ کانیں تھیں جو النبی کے شہر پر کتنی سو سال پہلے وقف ہو چکی تھیں[۱]، یا ارض فرعون مصر کا پانچواں حصہ جو حرمین پر وقف تھا۔ شاید بیل اور ہل پر ان کی نظر بھی نہیں پڑی تھی، کھجور کے باغوں کے لئے کدالوں اور پھاوڑوں کی کھدائی کافی تھی مگر مولانا نے بیل بھی نجد سے منگوائے، ایشیا، کوچک کے ایک ترک کو ملازم رکھا جو زراعت کا ماہر تھا، ایک قدیم کنواں جو اس علاقہ میں تھا اس کو صاف کرایا گیا۔ اونٹوں سے حرث کشی کا کام لیا جاتا تھا۔ اپنا پشتینی پیشہ زراعت ہی تھا اور اب بھی ہے، اس مناسبت سے عصر کے بعد عموماً حضرت والا کی اس جدید کاشت کی طرف چلا جاتا اور مدینہ کے ان میدانوں میں ان ہی چیزوں کو ڈھونڈتا پھرتا جس کے ڈھونڈھنے کے سوا مومن کا کوئی دوسرا لذیذ مشغلہ نہیں

---

[۱] تاریخوں میں لکھا ہے کہ سلطان محمد فاتح جس نے کل ۲۳ سال کی عمر میں قسطنطنیہ قیصر کے شہر کو فتح کیا تھا۔ فتح کے ساتھ ہی شہر میں جس وقت داخل ہوا تو پہلا فقرہ اس کی زبان پر یہی جاری ہوا کہ قیصر کے شہر کو نبی کے شہر پر میں نے وقف کر دیا۔۱۲

نہیں ہوسکتا، اسی عرصے میں قبا کی مسجد کی حاضری کی سعادت بھی کبھی تنہا کبھی رفقا کے ساتھ میسر آئی، تنہائی کی سیر کا وہ لطف، اس لطف کے مزوں سے اب بھی دل لذت گیر رہتا ہے۔ راستہ کھجوروں کے ہرے بھرے باغوں سے آراستہ تھا۔ باغوں میں کھجوروں کے سوا انار، انگور کے درخت اور بیلیں بھی نظر آئیں، طرح طرح کے پرندے درختوں پر چہچہاتے، کبھی کبھی پانی کے گڑھے کے کنارے بگلے بھی اڑتے ہوئے دکھائی دیئے، کہیں فاختہ پر بھی نظر پڑتی، بیر اریس پر چرس چلتا رہتا۔ شفاف پانی نالیوں میں بہتا رہتا، اریس کے من پر بیٹھ کر پاؤں لٹکاتا۔ بیتے ہوئے دنوں کو یاد کرتا، انہی دنوں کو جو اس دنیا میں واپس نہ آئیں گے۔

ایک ہفتہ کے بعد ہی دل کی کیفیت یہ ہوگئی، کہ مدینہ کے سوا کچھ یاد نہیں رہا۔ ہندوستان کے اعزا، واقربا، جامعہ عثمانیہ کی پروفیسری، ہر چیز دماغ سے نکل گئی، یہ قطعی فیصلہ دل کا ہوا، زبان کا ہوا۔ ذائقہ کا ہوا، کہ جو پانی یہاں پینے کے لئے مل رہا ہے، نہ پہلے کبھی کسی ملک میں ملا تھا اور نہ آئندہ ملے گا، نہ اتنا مینو سواد ماحول نہ یہ رعنائیاں، یہ زیبائیاں کہیں اور میسر آئیں گی، نیند جیسی وہاں آتی ہے کہیں نہیں آتی، سرور ونشاط سے دل جتنا لبریز ہوا کبھی نہیں ہوا، دوسروں سے پوچھتا تھا تو وہ بھی یہی کہتے تھے۔ جنت میں داخل ہوجانے کے بعد اس سے باہر ہونے کی حماقت میں کون مبتلا

ہوگا دل اس سوال کو اٹھاتا اور اس ارادہ میں پختگی ہوتی چلی گئی، کہ جب رفقاء جانے لگیں گے تو رفاقت سے وقت پر انکار کردوں گا۔ پہلے پندرہ روز تک، اس خیال کا تسلط رہا۔ اس کے بعد کیا ہوا۔ بہت سی ناگفتنی کو گفتنی بنانے کے ارادے کے باوجود اس کو ناگفتہ ہی رہنے دیا جائے تو بہتر ہے۔

بمستوراں مگو اسرار مستی
حدیث جاں مپرس از نقش دیوار

ہاں! اس عرصے میں "سعودی عرب" کے بادشاہ جو اس وقت اس ملک کے لئے نئے بادشاہ تھے "بارادہ حج" ریاض سے مدینہ منورہ بھی پہنچے، مولانا عبدالماجد جو باوجود سب کچھ ہونے کے کم از کم اس وقت تک اپنے ساتھ اخبار کے ایڈیٹر ہونے کی حیثیت رکھتے تھے، ان کا خیال ہوا کہ عرب کے اس جدید حکمران سے ملاقات کرنی چاہیئے۔ امیر مدینہ سے مل کر بات طے ہوئی۔ ترجمانی کے لئے اپنے ساتھ اس فقیر کو بھی ہمرکابی کا حکم مولانا کی طرف سے دیا گیا۔ حکم کی تعمیل کی گئی۔

کرسیوں اور صوفوں کی طویل قطار تھی، جس پر نجدی عقال باندھے حکومت کے حکام بیٹھے تھے، ان میں "بادشاہ" کون ہے اس کی تمیز سخت دشوار تھی، وہی سرخ دھاگوں والا رومال اور سیاہ بالوں والی عقال سب کے سروں پر تھا، مولانا عبدالماجد صاحب حسب وعدہ پہلے امیر مدینہ سے ملے اور خواہش ظاہر کی کہ

بادشاہ سے وہیں تعارف کرادیں۔ مگر معلوم ہوا کہ امیر صاحب پر بےبسی طاری ہے، گھبرائے گھبرائے سے ہیں، تب فقیر نے ذرا جسارت سے کام لیا، قطار پر نظر کی ایک معمر آدمی تصویروں سے جس کی صورت کچھ پہچانی سی تھی، اور دائیں بائیں صوفے پر دائیں بائیں دو تکیے پڑے ہوتے تھے، یہی شاید سب سے بڑی امتیازی علامت بادشاہ کی تھی، الغرض اسی کی طرف بڑھ کر فقیر نے سلام عرض کیا، مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا، بادشاہ صوفے سے اٹھ کھڑے ہوئے سلام کا جواب دیتے ہوئے مصافحہ کیا۔ پوچھا کہ کہاں کے ہو؟ بتایا گیا، اور ساتھ ہی مولانا عبدالماجد کا ان الفاظ کے ساتھ تعارف کرادیا گیا کہ یہ ایک اخبار کے مدیر ہیں آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہتے ہیں۔ اس پر بادشاہ نے کہا کہ ضرور میں ان سے باتیں کروں گا، مگر اس کے لئے اس مجلس کا موقعہ مناسب نہ ہوگا آپ لوگ کل دارالامارہ میں ۸ بجے صبح کو ملیئے۔ بس اسی پر گفتگو ختم ہوگئی۔ کل کا وعدہ لے کر واپس ہوتے، دن تو خیر گذر گیا۔ مگر جوں ہی خوابگاہ میں لیٹا، خیالات کا ہجوم شروع ہوا، پوچھنے والا تو نظر نہیں آتا تھا، لیکن پوچھا جارہا تھا کہ تم کیا یہاں سلاطین اور حکام سے ملنے آتے تھے۔ کیا بادشاہوں کی دنیا میں کمی ہے، جہاں تم رہتے ہو، وہاں کے بادشاہ سے تو تم کبھی ملے نہیں[1]، لیکن یہاں آکر تم نے

---

[1] یعنی حضور نظام سے ملازمت کی تیس سالہ مدت میں خصوصی ملاقات کا موقعہ کبھی پیدا نہیں کیا گیا، البتہ سالگرہ وغیرہ خاص جشن کے دنوں میں دوسرے نوکروں کے ساتھ پیشکش نذر کے لئے حاضری ہوجاتی تھی۔

یہ کیا حرکت کی، پھر اب کیا کروں، وعدہ ہو چکا ہے، مولانا عبدالماجد چھوڑ ینگے نہیں، رات آنکھوں آنکھوں میں کٹ گئی کروٹوں پر کروٹیں بدلتا رہا، صبح ہوئی نماز کے بعد مولانا کی قیام گاہ پر حاضر ہوا دیکھا بخار میں مبتلا ہیں، آج کا بخار میرے لئے موجب شکر بن گیا! اسی وقت ایک مختصر سا رقعہ امیر صاحب مدینہ کی خدمت میں لکھ کر بھیج دیا گیا کہ اخبار کے جن مدیر صاحب کے لئے وقت ملاقات جلالۃ الملک نے مقرر فرمایا تھا، اتفاقاً ان کو بخار آگیا ہے اس لئے حاضری سے معذور ہیں جواب آیا کہ اچھا اس وقت تو مکہ معظمہ جا رہے ہیں۔ حج کے بعد وہیں ملاقات ہو گی۔ قصہ ختم ہو گیا اور بحمد اللہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔ تیس دن سے اس زائد مدت میں بیسیوں واقعات پیش آئے جن کا ذکر موجب تطویل اور غیر ضروری بھی ہے۔ زیادہ اثر جدید مدینہ کے جدید باشندوں کی مہمان نوازیوں کا تھا، عموماً مسلم دنبوں کے پیٹ میں پلاؤ پکایا جاتا تھا، جس میں علاوہ دوسری چیزوں کے بھنے ہوئے بادام اور تخم خیار بھی ہوتے تھے اس کھانے کا نام شائر کوزی تھا، بعض شامی کھانے بہت لذیذ تھے، گوشت تو یچ پوچھئے تو صرف دنبوں ہی کا ہوتا ہے، بافراط مختلف شکلوں میں پیش ہوتا تھا، دودھ کی بھی کمی محسوس نہ ہوئی۔ تقریباً ہر اچھے گھرانے میں بکریاں پلی ہوئی تھیں، دیکھنے میں دبلی پتلی لیکن سیر ڈیڑھ سیر سے معلوم ہوا کہ کم دودھ نہیں دیتی ہیں، برسیم ایک قسم کا ہرا چارہ ہے، جس کی کاشت کھجور کے باغوں میں بکثرت مروج ہے، علی الصباح

نخلولیؒ لوگ گدھوں پر اسی برسیم کو کاٹ کاٹ کر شہر میں لاتے اور بطور رتب
کے گھروں میں ایک ڈو بوجھے اس کے ڈالتے جاتے، پانی عموماً حبشی عورتوں
کو دیکھا کہ قیام گاہوں کو پہنچاتی ہیں۔ کپڑوں کو دھونے کا نظم اس شہر میں عجیب
تھا۔ بیویوں پر کھانے پکانے کا بار کم ڈالا جاتا ہے، روٹیاں بازار میں پکوائی
جاتی ہیں، صرف سالن لوہے کے چولہوں پر پکا لیا جاتا ہے مکان کے کسی گوشے
میں کھد کھد ہوتا رہتا ہے، اسی لئے مدینہ کے مکانات بڑے صاف و پاک ستھرے
معلوم ہوتے ہیں عورتوں کا وقت بہت بچتا ہے، اسی میں اپنے شوہروں اور
بچوں کے کپڑے وہ دھو لیتی ہیں اور خوب اچھا دھوتی ہیں، ہر گھر میں معلوم
ہوا کہ استری کا سامان بھی لازمی طور پر رہتا ہے یہ بیوی پر الزام ہوتا ہے
اگر شوہر کے کپڑے ناصاف یا داغ دھبے والے ہوں، فرض ہے کہ باہر
نکلنے سے پہلے اپنے خاوند کے لباس جوتے وغیرہ کو بیوی دیکھ لے، پالش
کی ضرورت ہو تو پالش کر دے گھوہ باشاہی (چلتے) کا دور تو ہر وقت
چلتا رہتا ہے، لیکن اصلی کھانا اس زمانے میں دیکھا کہ عموماً عصر و مغرب کے بعد
لوگ کھاتے ہیں درمیان میں ہلکے پھلکے ناشتوں سے کام نکال لیا جاتا ہے۔

لہ کھجوروں کی کاشت اور ان کے باغوں کی نگرانی کرنے والوں کو نخلولی کہتے ہیں۔ امامیہ فرقہ
کے لوگوں کو مدینہ کی شہری آبادی میں جگہ نہیں ملتی تھی نخلولوں میں ٹھہرنے لگے ان ہی کے اثرات
سے عموماً یہ شیعہ ہو گئے ہیں اپنے آپ کو جعفری کہتے ہیں۔

دعوت کرنے والے بزرگوں کے متعلق عموماً دیکھا کہ باہر سے آنے والے زائرین دعوت کے بعد ان کے ساتھ مخفی طور پر کچھ حسن سلوک بھی کرتے ہیں۔ اچھی بات معلوم ہوئی، مگر ایک دفعہ سخت ذلت بھی اٹھانی پڑی، مسجد نبوی کے باب مجیدی پر ایک مکتب خانہ تھا، ایک صاحب معلم الصبیانی کا کام انجام دیتے تھے، ان سے تعلق پیدا ہوا، دعوت پر مصر ہوتے، قبول کی گئی، فارغ ہونے کے بعد مصافحہ کے وقت حسب دستور کچھ پیش کیا گیا۔ اللہ اللہ اس وقت ہمارے ان مدنی بزرگ کے چہرے کی سرخی، فرمارہے تھے تم نے کیا مدینہ کے ہر باشندے کو گداگر سمجھ رکھا ہے، کیا دعوت اسی لئے کی جاتی ہے، شرم سے گردن جھک گئی، زمین میں گڑ گیا، معذرت خواہ ہوا۔ جرم معاف کیا گیا، بڑی مہربانی فرماتے رہے، چلتے ہوتے آبار سبعہ[1] کا پانی ایک ٹن میں اپنے مصارف سے منگوا کر حوالے کیا یہی پانی پہلی سوغات تھی، جو مدینہ منورہ سے اس لئے ساتھ رکھی گئی کہ اپنے گاؤں کے اس کنوئیں میں ملا دیا جائے گا جس کا پانی عمر بھر پینا ہے۔ اسی کے ساتھ کھانے کا خیال بھی آیا۔ یعنی کھانے میں بھی مسلسل ایسی چیز ملتی رہے، جس میں

---

[1] یعنی مدینہ کے وہ سات کنوئیں جن کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ لعاب دہن عالمین کے رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کا ان کے پانی میں شریک ہے، مسجد نبوی کے ان معلم صاحب کا نام محمد بن سالمین تھا، مکتب خانے میں بچوں کی سزا کا اصول دلچسپ تھا۔ قصور وار بچے کی طرف استاد کسی اصطلاحی اشارے سے نظر کرتا، سارے بچے مجرم کو ٹیک دیتے اور دونوں ٹانگیں اس کی اوپر کر دی جاتیں، تلوے پر استاد ایک دو چھڑی لگا دیتا، یہ بات پسند آئی۔ تلوے کی کھال موٹی ہوتی ہے تکلیف کا احساس کم ہوتا ہے۔

مدینہ منورہ کا کوئی جز شریک ہو۔ خیال گزرا کہ ترکاریوں اور بعض غلّوں کے بیج حاصل کرلئے جائیں، بآسانی مل گئے، ہندوستان تک پہنچے، ارادہ بھی تھا کہ ان ہی بیجوں سے کاشت کر کے ترکاریاں اگائی جائیں گی، لیکن جن لوگوں کے سپرد کیا گیا، انہوں نے زیادہ توجہ سے کام نہ لیا۔ تاہم کدو اور شلجم کا سلسلہ کئی سال تک جاری رہا۔

ذیقعدہ کا مہینہ اب قریب ختم ہونے کو آیا، حج کا مہینہ ذوالحجہ نزدیک آنے لگا، حج کی تیاریوں میں لوگ مصروف ہوتے، اسی عرصے میں ایک دن اخت العرفات (مدظلہا) مولانا عبدالماجد کی اہلیہ محترمہ نے خاص آدمی بھیج کر اپنی قیام گاہ پر بلوایا۔ حاضر ہوا، انہوں نے اپنا ایک خواب سنایا۔ عجیب خواب ہے وہ اودھ کی رہنے والی ہیں، فقیر کی مرحومہ والدہ غفر اللہ لہا جو کئی سال پہلے وفات پا چکی تھیں بہار کے ایک دیہات کی رہنے والی تھیں، انہوں نے ساری زندگی ریل گاڑی نہیں دیکھی تھی، ان کا سفر اپنے میکہ (موضع استھانواں) سے گیلانی تک محدود تھا، مگر ماجد میاں کے گھر نے سنایا، میں نے خواب میں دیکھا کہ گھر میں میرے کوئی تقریب ہے میں کھانا لوگوں میں تقسیم کر رہی ہوں، اتنے میں دیکھتی ہوں کہ ایک بیوی صاحبہ جن کی شکل و صورت ایسی تھی وہ فرما رہی ہیں کہ اس کھانے میں کیا ہمارا حصہ نہیں ہے؟ ماجد میاں کے گھر نے کہا کہ آپ ہیں کون؟ بولیں کہ تمہارے

ساتھ مناظر احسن جو آیا ہے میں اس کی ماں ہوں، اپنے بچے کے ساتھ یہاں چلی آئی ہوں"

یہ عجیب خواب تھا۔ آنکھیں اشک آلود ہوگئیں، ماں کی وہ گود یاد آگئی جس میں اتارا گیا تھا کھیلا تھا کھلایا گیا تھا، مولانا ماجد کے گھر نے شکل وصورت حلیہ جو بیان کیا تھا، وہ مرحومہ والدہ پر منطبق بھی تھا، یہی تعبیر سمجھ میں آئی کہ اپنی طرف سے حج کرلنے کی آرزو انہوں نے ظاہر کی ہے وہ بڑی نیک خاتون تھیں، غربا پروری ان کی فطرت تھی، اس سے زیادہ اور کیا عرض کروں۔ میری تو بہرحال وہ ماں ہی نہیں بہت کچھ ہیں۔ اٹھا، مولانا سید احمد صاحب مرحوم سے واقعہ کا ذکر کیا۔ حج بدل کی کوئی صورت یہاں ہوسکتی ہے۔ مولانا نے ایک صاحب کو تیار کیا۔ مدینہ منورہ سے میرے ساتھ چلنے کا وعدہ انہوں نے بہ نیت حج بدل فرمالیا۔

اب وقت بالکل سر پر آگیا۔ ارادہ پہلے سے تھا کہ پہلی ذوالحجہ کو ہمارا قافلہ مدینہ منورہ سے نکل پڑے گا۔ مگر لاری والوں کی طرف سے کچھ ایسے معاملات پیش ہونے لگے کہ دل دھڑکنے لگا، آج نہیں کل، کل نہیں پرسوں، بات ٹلنے لگی، ہاتھ پاؤں پھولنے لگے، کیا ہوگا، کیا ہم کم نصیبوں کے مقدر میں حج نہیں ہے سب سے زیادہ متاثر فقیر تھا کہ اسی کے اشارے سے لوگ مدینہ چلے آئے تھے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ لاری والوں کے ساتھ کیا کیا جائے۔ حکومت کی زنجیر بھی کھٹکھٹائی

گئی، مگر وہاں سے بھی چنداں حوصلہ افزا جواب نہ ملا۔ پریشانی کا عجب عالم تھا۔ اسی عرصہ میں ایک اور بات ایسی پیش آئی جو بھلائی نہیں جاتی۔ ہمارے ساتھ جہاز میں تعلقہ داران لکھنؤ میں سے ایک صاحب محمد علی نامی بھی تھے۔ عرف عام میں ان کو لوگ "محمد علی چھرد" کہتے تھے، خدا جانے اب زندہ بھی ہیں یا نہیں خود امامیہ مذہب رکھتے تھے، مگر بیوی ان کی سنی خاندان کی تھیں، بیوی کو حج کا شوق ہوا، محمد علی صاحب ایک اپٹوڈیٹ انگریزی خواں لیڈر قسم کے آدمی تھے، اپنی بیوی کو بمبئی تک پہنچانے کے لئے بمبئی آئے، مگر بمبئی میں خیال ہوا کہ ذرا آگے بڑھ چلو، جہاز پر سوار ہو گئے اور مدینہ منورہ تک وہ بھی ہماری تقلید میں ساتھ آئے۔ ان کی موٹر الگ تھی۔ مسجد نبوی میں احرام باندھ کر روضہ طیبہ پر رخصت ہونے کے لئے حاضر ہوئے۔ فقیر بھی مسجد کے کسی گوشہ میں تھا رخصت ہو کر جب چھرد صاحب چلنے لگے، تو مجھ پر نظر پڑی، سامنے آئے، ہوش و حواس غائب تھے۔ صرف یہ کہتے جاتے تھے۔

"مولانا! گیا تھا، کہہ کے آیا ہوں، آج آستانہ پر حاضر ہوا ہوں
کل جب وقت روانگی کا ہو تو آپ بھی تشریف لائیے گا!"

آنکھیں سُرخ اشکبار تھیں۔ روتے جاتے تھے، رلاتے جاتے تھے ان کا روانہ ہو جانا اور غضب ہوا، قافلہ والوں میں گونہ برہمی پیدا ہوئی، نزلہ کا رخ زیادہ تر اسی دیوانے کی طرف تھا۔ اسی نے سب کی راہ ماری، حج سے محروم

کیا چیپ تھا، کیا خود ہی نہیں بلکہ اپنے جرم میں دوسروں کو بھی ان کے حج سے محروم کرا دیا جائے گا۔

چیرو صاحب چلدیئے اور جو بھی جانے والے تھے مسلسل جا رہے تھے۔ ہماری کھینی اب بھی صحیح وقت نہیں بتا رہی ہے۔ عربدہ بازیوں سے کام لے رہی ہے۔

رات کا وقت تھا۔ رباط جس میں مولانا عبدالباری ان کے والد والدہ کے ساتھ یہ فقیر بھی مقیم تھا۔ سب سوئے ہوئے تھے! اسی فکر میں سوئے تھے کہ دیکھئے کل کیا صورت پیش آتی ہے کیونکہ غالباً ذوالحجہ کی ۳ بھی گذر چکی تھی، ۴ تاریخ تھی۔ تین بجے کا وقت ہوگا، ہم لوگوں سے دور مولانا کی والدہ، آرام فرما رہی تھیں کہ اچانک ان کی طرف سے "پیارے پیارے" کی آواز بھرائی ہوئی آنے لگی یہ مولانا عبدالباری کا خانگی نام بچپن کا تھا۔ ان کی والدہ اب بھی زیادہ تر اسی نام سے مولانا کو پکارتی تھیں، میری آنکھیں بھی کھل گئیں اور مولانا والدہ کے پاس دوڑے ہوئے پہنچے، کیا ہے اماں کیا ہے اماں! ان کی ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں۔ ان ہی ہچکیوں میں ملی ہوئی آواز کے ساتھ فرما رہی تھیں۔

"میں نے ابھی خواب دیکھا ہے، دیکھا کہ ایک بزرگ ہیں دل میں لگا ہوا کہ خود مدینہ والے سرکار ہیں، صلی اللہ علیہ وسلم سامنے لاری کھڑی ہے ہم لوگوں کا اسباب بھی پڑا ہوا ہے حکم دیا جا رہا ہے کہ ان مسافروں کو جلد سوار کر دو، ان کو فوراً حج کے لئے مکہ پہنچا دو۔"

یہ یا کچھ اسی قسم کے الفاظ تھے۔ شاید یہ بھی مولانا کی والدہ ماجدہ نے فرمایا کہ "خود یہ کچھ اسباب کو اٹھا اٹھا کر لاری میں دیکھا کر" وہ ڈال رہے ہیں سہ

گفتی سر تو بستہ فتراک ما سزد
سہل است اگر تو زحمت ایں باری کشی

خاکسار بھی سن رہا تھا، ہوش جاتے رہے چیخ نکل گئی، مولانا کے والد بھی بیدار ہو گئے، اب کسی کو کسی کی خبر نہ تھی، یہ کیا ہے یا اللہ یہ کیا ہے گریہ وزاری میں رات کٹی ع

نظر جانب ہر گنہ گار داری

کے تجربوں کا اعادہ مسلسل ہو رہا ہے، صلوات اللہ علیہ وسلامہ کہاں ہندوستان کے چند ٹوٹے پھوٹے نام کے مسلمان حقیر ذرے اور کہاں غیب وشہادت کا آفتاب عالمتاب، مرکز کائنات ایمان کے ساتھ حاضر ہونے والوں کو سلامتی کی دعا سے سرفرازی بخشی جائے اس قرآنی حکم کی تعمیلی شکل کا یہ کتنا اچھا مشاہدہ تھا ایمان کے ساتھ ایمان کے عملی اقتضاؤں کی تکمیل کرنے والے کن نوازشوں سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں ان کا کون اندازہ کر سکتا ہے، خالق کائنات کے ساتھ نسبت کی تصحیح کائنات کے ذرہ ذرہ کی نسبت کو درست کر دیتی ہے اس راز کو وہ کیا پا سکتے ہیں جو مخلوق سے مستفید ہونے کے لئے مخلوق ہی کو پوج ڈالتے ہیں وہ اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ خالق سے دور ہو کر اسی خالق کی مخلوق سے کیسے

قریب ہو سکتے ہیں؟

خیر صبح ہوئی، مسجد نبوی میں نماز ادا کر کے واپس لوٹ رہے تھے کہ راستہ میں کمپنی کا نمائندہ ملا، تیار ہو جاؤ، لاری بس اسی وقت کھلے گی، مسرت کی لہر دوڑ گئی، قافلہ کے لوگ تیار ہو گئے سوار ہو گئے، اور ۳ ذوالحجہ کو مدینہ منورہ میں تھے، شاید ۵ کی شام کو وہ مکہ معظمہ کی گلیوں میں گھوم رہے تھے ؎

مور مسکیں ہوسے داشت کہ در کعبہ رسد
دست بر پائے کبوتر زد و ناگاہ رسید

کا قصہ بجائے قصہ کے واقعہ بنا ہوا تھا، شاید ڈیڑھ دن میں راستہ طے ہوا، نکلنے کا خیال تو دل سے پہلے ہی نکال دیا گیا تھا[1]، اس لئے مدینہ سے نکلنے پہ جس کیفیت کا اندیشہ تھا الحمد للہ کہ وہ طاری نہ ہوئی، ذوالحلیفہ (بیر علی) میں

---

[1] بحرین کے علاقے کے ایک کرسچین (عیسائی) جارود نامی تھے۔ آستانہ نبوت کبریٰ پر حاضر ہو کر بیعت اسلام سے سرفراز ہوئے طبرانی وغیرہ میں ہے کہ فرح بہ وقربہ وادناہ (رسول اللہ ان کے اسلام سے بہت خوش ہوئے ان کو قرب بخشا گیا اور ان کو نزدیکی عطا کی گئی) مدینہ سے رخصت ہونے کے بعد ایک قصیدہ لکھا جس کے دو شعر یہ تھے۔

فابلغ رسول اللہ عنی رسالة یانی حنیف حیث کنت من الارض
فان لم یکن واری بہ یثرب فیکم فانی لکم عند الاقامة والنغض

جس کا حاصل یہ ہے کہ رسول اللہ تک اس فقیر کا یہ پیغام پہنچا دیا جائے کہ وہ ہر جگہ باطل سے ٹوٹ کر سچ کے ساتھ لپٹا ہوا ہے خواہ زمین کے اس کونے پر کسی جگہ بھی ہے میرا گھر اگر یثرب مدینہ میں آپ لوگوں کے درمیان نہیں ہے تو کیا ہوا، میں آپ ہی کے لئے ہر حال میں ہوں۔ نشست و برخواست ہر حال میں۔ (اصابہ صفحہ ۲۶۱)

گاڑی رکی، سامنے مسجد تھی، مسجد کے پاس صاف و شفاف پانی سے بھری ہوئی ایک کافی عریض و عمیق باوڑی[1] تھی، خوب نہائے تیرے اور مسجد میں آکر احرام باندھا، الفاظ کہاں ہیں جو شکر و امتنان کے جذبات کی ترجمانی کی گنجائش رکھتے ہوں ؎

جو کچھ کہ ہوا ہوا کرم سے تیرے
جو کچھ کہ ہوگا تیرے کرم سے ہوگا!

مدینۂ منورہ کی منزل ختم ہوگئی، رسول کے دربار سے باریاب ہو کر اب اللہ کے بندے اللہ کے دربار میں تھے جس کا قصہ انشاء اللہ دوسرے حج نمبر میں زندگی نے وفا کی تو سنایا جائے گا۔

مدینہ منورہ میں آستانہ نبوت کبریٰ کے سوا دوسرا مقام جہاں زمین پر وہ سب کچھ مل جاتا تھا جو شاید آسمانوں میں بھی نہ ملے۔ وہ جنت البقیع کی خوابگاہیں تھیں جن جن کی تلاش تھی، سب وہیں مل جاتے تھے۔ صبح و شام اس کا پھیرا ہوتا تھا اُحد کے دامن میں بھی گذر کا موقعہ دیا گیا۔ عقیق کی ندی جو دامن احد میں گویا ایک برساتی نالہ ہے۔ اس کے پانی سے وضو کیا۔ ایک دن مدینہ میں بارش کا لطف بھی حاصل ہوا۔ مسجد نبوی کی میزاب کے نیچے غسل کرنے والوں نے غسل کیا۔ الغرض ایک مہینہ تین دن کی یہ مدت زندگی کی ایسی مدت تھی، جس کی نظیر پچاس ساٹھ سال کی طویل مدت میں نہ ملی ہے نہ مل سکتی ہے۔

---

(۱) کنواں

بقیع کا ایک واقعہ

اس سلسلے کا ایک ارتسام ذہنی ایسا ہے جو مٹائے نہیں مٹتا، بقیع کی
کی جنت کی سیر میں تنہا مصروف تھا کہ اچانک ایک سرخ وسپید چھریرے
بدن والے نوجوان کلہ سیاہ داڑھی سے بھرا ہوا، سامنے سے گزرتے ہوئے
معلوم ہوئے۔ انہوں نے مجھے دیکھا میں نے ان کو سلام کیا۔ سلام سے
راہ ورسم کی ابتداء ہوئی دریافت سے معلوم ہوا کہ مراکش وطن ہے۔ مجھ
سے پوچھا گیا تو کہاں کا ہے؟ ہند جواب دیا گیا۔ اسی کے بعد واقعہ پیش آتا
ہے۔ مراکشی نوجوان نے عربی میں کہا کہ ہندوستان پر تو انگریزوں کی حکومت
ہے، ہاں کہتے ہوئے فقیر نے عرض کیا کہ مراکش پر بھی تو فرانس قابض ہے۔
اس فقرے کے بعد پھر کیا ہوا؟ میں نے دیکھا کہ نوجوان مراکشی مجھ سے لپٹا
ہوا ہے سامنے قبہ خضراء تھا اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے بلبلاتے اور
چیختے ہوئے وہ کہہ رہے تھے یا رسول اللہ إن أمتك في الأسر
في أسر النصارى۔ (یا رسول اللہ آپ کی امت قید وبند میں گرفتار ہے
نصاریٰ کی قید وبند میں) وہ بھی رو رہے تھے، اور جس کے ساتھ لپٹے
ہوئے تھے وہ بھی رو رہا تھا، دونوں کی التجا کا رخ ایک ہی طرف تھا،

مغرب اقصیٰ اور مشرق کے دور دراز کے دو باشندوں کا جو درمیانی مقدس رابطہ تھا۔ اسی سے عرض کر رہے تھے، کچھ دیر یہ وقت بھی خوب گزرا، اور جس وقت مواجہ مبارک میں ہندی، جاوی، بخاری، شامی، مغربی، ایشیائی افریقی، گورے کالے، لال پیلے، اونچے اونچے قد والے چھوٹی چھوٹی قامت رکھنے والے طرح طرح کے لوگ رجوع ہوتے، سلام عرض کرتے، خدا جانے دوسرے کن نگاہوں سے اس منظر کو دیکھتے تھے، یا اب بھی دیکھتے ہیں لیکن اچانک اپنے خیال کے سامنے حشر کا میدان آجاتا، وہی میدان جہاں بکھرے ہوئے پتنگوں کی طرح آدم کی اولاد ماری ماری پھرے گی اور العالمین کے رسول پر ایمان لانے والی امت اپنے رسول کو ڈھونڈھے گی اور پائے گی، آج ایک ہلکا سا نقشہ اسی میدان کا سامنے تھا۔ دیر تک اس کے نظارے میں غرق رہتا۔ بجلی کی طرح دل پر واردات گذرتے، گذرتے رہتے۔

سچی بات تو یہی ہے کہ ہر طرف یہاں بجلی ہی بجلی، برق ہی برق، نور ہی نور تھا، صرف روشنی تھی، تاریکی کا نام نہیں تھا۔ صرف سکون تھا، بیچینی کا پتہ بھی نہ تھا۔ صرف محبت تھی، محبت ہی محبت کا چشمہ فوارے کی طرح اچھل رہا تھا ابل رہا تھا۔ صلی اللہ علیہ وعلی آلہ وصحبہ اجمعین۔

ہاں! ایک آخری بات بھی سن لیجئے۔ مدینہ منورہ پہونچ کر اکیس آدمیوں کا یہ قافلہ مختلف قیام گاہوں میں تقسیم ہوگیا۔ مولانا عبدالباری ان کے

والدین اور فقیر کا قیام ایک ہی جگہ تھا۔ قیام کے ساتھ ہم چاروں کے طعام کا نظم بھی مشترک تھا۔ روانگی سے پہلے حساب کیا گیا کہ ایک مہینہ تین دن میں طعام کے مصارف کیا ہوئے، کھانے میں فراخدلی اور وسعت سے کام لیا جاتا تھا۔ ناشتہ میں چائے کے سوا کباب، انڈے، دہی اور طرح طرح کی چیزیں بھی شریک رہتی تھیں، یہ صحیح ہے کہ غیر تاریخی گرانی جس کا تجربہ جنگ عظیم کے بعد والی جنگ اعظم کے بعد دنیا کو ہوا ہے اس کا ذکر تو شاید بنی نوع انسانی کو تاریخ کے کسی دور میں اس کا سان گمان بھی نہ ہوا ہوگا اور موجودہ زمانے کے لحاظ سے نسبتاً ارزانی ہی تھی، لیکن جنگ اعظم نہ سہی، یہ سفر ہم لوگوں کا جنگ کے بعد ہوا تھا۔ عرب جنگ عظیم سے غیر معمولی طور پر متأثر تھا۔ مسلسل انقلابوں سے اس ملک کو گذرنا پڑا تھا۔ عربوں کو پیار کرنے والی حکومت ترکی کا اقتدار عرب سے ختم ہو چکا تھا۔ اس لئے ہندوستان کے لحاظ سے وہاں غیر معمولی گرانی تھی۔ بھاؤ تو اب یاد نہیں رہا۔ مگر پھر بھی غیر معمولی گرانی ہی تھی۔

مگر مولانا عبدالباری صاحب نے جب حساب کیا تو وہ کچھ بھچکے سے ہو کر رہ گئے، میں بھی سن کر حیران تھا، جب مولانا فرمانے لگے کہ ایک مہینہ تین دن کی اس پوری مدت میں فی کس آٹھ روپے کا حساب پڑتا ہے، کل آٹھ روپے، جس میں کھانا بھی ہے اور ناشتہ بھی اور چائے بھی۔ کچھ تکلفات بھی، بار

بار میزان کی جانچ کی گئی، عددوں کو دیکھا گیا۔ لیکن آٹھ سے آگے یہ عدد کسی طرح نہ بڑھا، مجبوراً تسلیم کرنا پڑا کہ سماں میں درحقیقت یہ سارے دن گذرے، آٹھ کا عدد بھی صرف "پردہ" تھا۔

اس محسن کریم کے قربان جائیے
احسان جس کا صورت احساں میں نہ تھا

اللّٰهم صلی وسلم وبارك عليه وآله وصحبه وأهل بيته أجمعين۔ وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين۔